بامقصد روزہ

جناب ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((الصيام جنة فلا يرفث ولا يجهل ، وإن امرؤ قاتله أو شاتم فليقل: "إني صائم" مرتين .))

(صحيح بخاری ، رقم: ۱۸۹٤ ، صحيح مسلم ، رقم: ۱۱۵۱)

"روزہ (ہر قسم کے گناہ سے) ڈھال ہے، چنانچہ (روزے دار) نہ تو بے ہودہ گوئی کرے اور نہ کارِ جہالت انجام دے۔ اگر کوئی اس سے لڑائی جھگڑا یا سب وشتم کرنا چاہے تو وہ اسے دو بار کہے: میں روزے سے ہوں۔"

رمضان کی حقیقت

وہ آفتاب جس کا مطلع حظیرہ القدس تھا، وہ آفتاب جس کا مغرب سینہ نبوی تھا، وہ آفتاب جس نے عالم کو منور کیا، قرآن مجید تھا، جو ماہِ مقدس کی شب مبارک میں آسمان سے زمین پر نازل ہونا شروع ہوا۔ وہ کون سا ماہِ مقدس تھا جس میں خدا کا کلام بندوں کو پہنچنا شروع ہوا؟ وہ ماہِ رمضان تھا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ﴾ [البقرۃ:۱۸۵] ’’رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اُترا، جو لوگوں کے لیے سرتاپا ہدایت ہے، جو ہدایت وتمیز حق وباطل کی نشانی ہے۔‘‘

ہماری بھوک پیاس؟: پس ان ایام میں ہماری بھوک، ہماری پیاس، ہمارا مادیاتِ عالم سے اجتناب، اس یادگار میں ہے کہ ہم تک جو خدا کا پیغام لایا، وہ ان دنوں بھوکا اور پیاسا تھا، اور وہ تمام لذائذ مادی سے مجتنب تھا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ [البقرۃ: ۱۸۵] ’’پس جو اس مہینے میں زندہ موجود ہو وہ روزے رکھے۔‘‘ یہ اس کا حال تھا جو کوہِ فاران (کوہ حرا) کی چوٹی سے جلوہ گر ہوا تھا (محمد ﷺ)۔ لیکن وہ جو سینا سے آیا (موسیٰ علیہ السلام)، وہ بھی تورات لینے کے لیے جب پہاڑ پر چڑھا تھا، وہاں چالیس روز بدلی کے درمیان خداوند کے حضور رہا تھا (خروج: ۴۰۔۱۸) اسی طرح وہ بھی جو کوہِ سعیر (کوہِ زیتون) سے طلوع ہوا تھا (مسیح علیہ السلام)، اس سے پہلے کہ وہ خدا کی منادی شروع کرے، جنگل میں چالیس روز دن رات بھوکا اور پیاسا رہا تھا۔ (متی: ۴:۲)

پس ضرور تھا کہ وہ جو کوہِ فاران سے جلوہ گر ہونے والا تھا وہ بھی، اس سے پہلے کہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ وہ آئے اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہو، خداوند کے حضور بھوکا اور پیاسا رہے تاکہ جو لکھا گیا ہے وہ پورا ہو: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرۃ:۱۸۳] ’’مسلمانو! تم پر روزہ اسی طرح لکھا گیا ہے جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا تھا۔‘‘

وجہِ اتباعِ طریقہ محمدیہ: پس رمضان کی حقیقت کیا ہے؟ وہ ماہِ مقدس جس میں داعی اسلام حسبِ اِتباع نوامیس نبوت، تحمل نزول قرآن کے لیے ضروریات مادیہ سے مستغنی رہا اور اس لیے ضروری ہوا کہ پیروانِ ملت اسلامیہ اور متبعین طریقت محمدیہ ان ایام میں ضروریات مادیہ عالم سے مستغنی رہیں کہ اس توفیق ہدایت کا شکریہ و ممنونیت اور اظہار اطاعت وعبودیت ہو جو ان کو اس ماہِ مقدس میں عطا ہوئی:

’’ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اترا، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، جو ہدایت اور تمیز حق و باطل کی نشانی ہے۔ پس جو اس مہینے میں زندہ موجود ہو، وہ روزے رکھے، جو بیمار یا مسافر ہو وہ ان کے بدلے اور دنوں میں روزے رکھ لے۔ خدا تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو (اور روزے کیوں فرض ہوئے؟) اس لیے کہ تم خدا کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو، نیز اس لیے کہ اس کی شکر گزاری میں سرگرم رہو!‘‘

تشکر نعمتِ عظیمہ واحسانِ اکبر: ہم کو صاف بتا دیا گیا کہ مفروضیت صیام ورمضان صرف اس لیے ہے کہ ہم اس عطائے ناموسِ فرقان وہدی (قرآن) پر خدا کا شکر بجا لائیں اور اس کے نام کی تقدیس کریں۔ پس کون مسلم ہے جو خدا کے اس احسانِ اکبر اور نعمت عظیمہ کے شکر کے لیے تیار نہیں؟ اور اس کی تقدیس کے لیے آمادہ نہیں؟ اس کی تقدیس وتمجید میں خود کو فراموش کرو۔ اس کے کلام کی عظمت کو یاد کرو جس نے تم جیسی زار ونزار و کمزور قوم کو اپنی تسلی سے قوی کیا کہ جو پھر کبھی کمزور نہ ہوگی، جس نے ۱۳۴۴ برس ہوئے، توحید کی آگ تمھارے سینوں میں روشن کی کہ پھر کبھی نہیں بجھے گی، جس نے تمھارے سر پر تاجِ خیرالامم رکھا جو کبھی نہیں اتر سکتا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

بانی: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ

سرپرست: مولانا ابوبکر صدیق السلفی حفظہ اللہ

21 شعبان المعظم 1435ھ جمعة المبارک 20 تا 26 جون 2014ء

الاعتصام

ہفت روزہ

مسلک اہلحدیث کا داعی و ترجمان

یکے از مطبوعات دارالدعوة السلفیة

شمارہ 25 جلد 66

بدل اشتراک

فی پرچہ	:	-/12 روپے
سالانہ	:	-/500 روپے
بیرونی ممالک سے	:	-/200 ریال -/60 ڈالر امریکی

خط کتابت کے لیے	:	ہفت روزہ الاعتصام، 31 شیش محل روڈ، لاہور
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر	:	ABL 2466-4 بلال گنج برانچ، لاہور
فون نمبر	:	042-3735 4406
فیکس نمبر	:	042-37229802
رجسٹرڈ نمبر	:	CPL : 12

E-Mail: al.aitisam@gmail.com

پرنٹر: پرنٹ یارڈ پرنٹرز، لاہور۔ ناشر: حافظ احمد شاکر، مقام اشاعت: 31 شیش محل روڈ لاہور 54000

اداریہ

محبت بھری توجہ اور انعطاف

حافظ احمد شاکر

شعائر اسلام کا احترام کرنا اس لیے ضروری ہے کہ سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''یہ اور جو اللہ کے نام کے چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔'' (٣٢/٢٢) اسی طرح ان شعائر کا احترام جن الفاظ سے نبی ﷺ نے فرمایا ہمیں بھی انہی الفاظ کو نہ صرف استعمال کرنا بلکہ ان الفاظ کا اہتمام کرنا چاہیے کہ آپ کی زبانِ وحی سے نکلا ہوا ہر لفظ معانی کا ایک سمندر رکھتا ہے۔

شعبان کے آخری اور رمضان المبارک کے معروف استقبالیہ خطبے میں نبی ﷺ نے رمضان المبارک کو ''شہر عظیم'' اور ''شہر مبارک'' فرمایا۔ عالمی طاغوتی مافیا جو اتحاد و یکجہتی کے نام پر کئی سال سے پوری دنیا میں ایک ہی دن عید کرنے کا مفسدانہ پروپیگنڈا کر رہا ہے اس مافیے نے نے چند سالوں سے ''رمضان المبارک'' کو ''رمضان کریم'' لکھنا اور اس کو شہرت دینا شروع کر رکھا ہے جب کہ آپ ﷺ نے اس کو ماہ عظیم اور ماہ مبارک فرمایا ہے۔ آپ کی زبانِ صدق اللسان نے جس مقام، دن، مہینے کے لیے جو الفاظ بطور صفت بیان فرمائے ہمارا ایمان ہے کہ وہ صفت اور لفظ منزّل من اللہ ہیں کہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے: ''اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے وہ تو صرف وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔'' (٣،٢/٥٣) اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ رمضان کو صرف رمضان المبارک کہیں کہ یہ لفظِ مبارک زبانِ رسالت مآب ﷺ سے نکلا ہوا اور اپنے اندر معانی کا ایک بحر بیکراں رکھتا ہے۔

تو حضرات یہ ماہ مبارک توبہ وانابت کے مواقع اور رحمت و برکت کی برکھا بھی اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس کی ایک برکت یہ بھی ہے کہ ہم سال بعد اس ماہ کے طفیل قارئین الاعتصام سے شرف تخاطب حاصل کر لیتے ہیں، کچھ ماضی کے تذکرے دہرا لیتے ہیں اور کچھ مستقبل کے منصوبوں کی دلوں میں اُمنگوں کا اظہار کر لیتے ہیں جن کا آپ سے ذکر کر کے لطفِ اپنائیت کا حظ اُٹھا لیتے ہیں اور آپ کی توجہات خصوصیہ کا حسن ظن رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ آپ رفقاء دار الدعوۃ السّلفیہ اور کارکنان الاعتصام کو ہمیشہ سے ممکن حد تک اطمینان وسکون بہم پہنچانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ جزاکم اللہ

دار الدعوۃ السلفیۃ ہے تو خالصتاً ایک خالص علمی تحقیقی اور تبلیغی ادارہ۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ دار الدعوۃ السلفیۃ علماء، فضلاء، محققین، مفسرین قرآن اور شارحین حدیث کے دامنِ علم کو دلائل وماٰخذ سے مالا مال اور مراجع ومصادر سے آراستہ کرتا ہے۔ تاہم دعوتی نقطہ نظر سے بھی بعد نماز ظہر کئی سال قبل مختصر درس حدیث کی ابتدا کی تھی جو بفضلہٖ تعالیٰ اب تک جاری بھی ہے اور جس کو نماز پڑھنے والے احباب ورفقاء بھر پور شوق سے سنتے بھی ہیں۔ دعوتی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے تقریباً چھ ماہ قبل ہمارے صدر گرامی مولانا ابو بکر صدیق السّلفی حفظہ اللہ کے مشورہ بلکہ حکم سے بعد نماز ظہر ماہانہ درس قرآن وحدیث شروع کیا تھا جن سے اب تک مولانا قاری عبدالمتین اصغر حفظہ اللہ، پروفیسر حافظ ثناء اللہ خاں حفظہ اللہ، مولانا حافظ عبدالوحید حفظہ اللہ (مدیر دار الفلاح)، مولانا حافظ عبدالسلام بھٹوی حفظہ اللہ، مولانا قاری محمد عزیر حفظہ اللہ اور مولانا قاری محمد طیب بھٹوی حفظہ اللہ خطاب کر چکے ہیں۔ بفضلہٖ تعالیٰ ان دروس کے مثبت تبلیغی اثرات بھی علاقے میں نمایاں ہونے لگے ہیں، یہ سب کچھ آپ کی محبت بھری توجہات اور انعطافات کے ساتھ ہی ممکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ اور ہم سب کو اپنی مرضیات سے نوازے۔ آمین ثم آمین

ہاتھوں کی گرہ اب مونہہ سے کھولیں:

ہفتہ رفتہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں جو افسوسناک واقعہ ہوا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ خصوصاً آٹھ انسانی، جانوں کا ضیاع! اتنا بڑا

حادثہ ہے جس کو صریحاً قتل مسلم بھی کہا جا سکتا ہے کہ گولی تو باعث ہلاکت ہی ہوتی کوئی گلاب کا پھول تو نہیں اس میں گولی چلانے کا حکم دینے والے کو دفاع کی رعایت آسانی سے دینا نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس موضوع پر اخبارات کچھ ہونی اور کچھ ان ہونی کہانیاں باہر لا رہے ہیں کہ آزاد صحافت اسی کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کار پردازان حکومت کے کچھ اندرونی فیصلے بھی عیاں ہو رہے ہیں اور کچھ فیصلے مرچ مصالحہ سمیت طشت از بام کرنے کی خبریں بھی دی جا رہی ہیں۔

....

اصحاب ثروت اور خوش حال خاندان کی جب اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے تو وہ عموماً ان کی فراخ دستی، غریب پروری اور دریا دلی سے نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ان کے رفقائے کار، رشتہ داروں، دوست احباب اور دینی راہ نماؤں میں سے ''باصلاحیت'' افراد ان کو دھیرے دھیرے چاپلوسی اور خوشامد کا عادی بنا دیتے ہیں اور دینی پیشوا ان کو خوابوں اور بشارتوں سے اولاً متاثر پھر مرعوب اور آخر میں اپنا اندھا معتقد بنا لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی اکثریت دینی علم خصوصاً قرآن وحدیث کا براہِ راست مطالعہ نہیں کرتی اس لیے وہ بہت جلد ان کی جھوٹی سچی خوابوں اور بشارتوں کی بھرے میں آ جاتے ہیں۔ ہمارے موجودہ حکم ران بلاشبہ دینی جذبہ وشوق بھی رکھتے ہیں اور خدا ترس اور فراخ دست بھی ہیں لیکن کاروباری و دنیاوی علم اور تجربوں کا ایک عالم رکھتے ہوئے بھی قرآن وحدیث کا براہ راست علم حاصل کرنے یا...... صرف...... قرآن حدیث سننے کی ان کے پاس فرصت ہمیشہ کم ہی دیکھی جاتی ہے۔ محاورتاً نہیں عملاً اپنے کندھوں پر بٹھائے پیشوا ہی اب ان کے گلے اس حد تک پڑنے لگے ہیں کہ وہ وزیر اعظم ہاؤس تک پہنچنے کے لیے کسی سابقہ مرید اور نیاز کو روندنا بھی عیب نہیں جانتے۔ عقابی نگاہ رکھنے والے عالمی شکرے تو اس طرح کے باصلاحیت افراد کو کام میں لانے کی دیر نہیں کرتے۔ ایوان ہائے اقتدار ان کی مراد پوری ہونے تک ان کو ارادی یا غیر ارادی ڈھیل دیے جاتے ہیں۔ پھر ہاتھوں کی گرہ مونہہ سے کھولنی پڑ جاتی ہے۔

....

ہر شعبے اور ہر طبقے کے افراد کا مزاج اپنے اپنے شعبے اور ماحول کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ استاذ اور ٹیچر ہر جگہ استاذ اور ٹیچر ہی رہتا ہے عموماً وہ اپنے سے ہر بات کرنے والے کو لاشعوری طور پر شاگرد ہی سمجھتا ہے، خطیب ہر مخاطب کو سامع جانتا ہوا اپنی ہی سناتا جائے گا چاہے کسی کے پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے۔ جاگیردار اپنے مخاطب کو اگر پٹواری...... یا ان داتا...... سمجھے گا تو ممیانہ شروع کر دے گا وگرنہ آنے والے ہر فرد سے مزارع جانتے ہوئے فرعونی لہجے میں ہم کلام ہوگا، صنعت کار کے نزدیک ہر انسان اس کا اجیر ہوتا ہے جس کی نہ عزت نفس کا اسے احساس ہوتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کے یعنی آپ کے مفاد کا۔ اس نے ہر فرد سے ہر حکم اور ہر فیصلے سے بہر طور اپنا مفاد ہی کشید کرنا ہوتا اور وہ یہ کر گزرتا ہے۔

وطن عزیز کے لیے درد دل رکھنے والے بعض اصحابِ علم و دانش ایک عرصہ تک یہ تقاضا بھی کرتے رہے اور تجویزیں بھی دیتے رہے کہ جس طرح انتظامی افسران کے ایک گریڈ سے آگے جانے کے لیے گورنمنٹ نے ان کی تربیت لازمی قرار دے رکھی ہے اس طرح اقتدار کی خواہش مند یا اقتدار کے متوقع حکم رانوں کی ایک تربیت گاہ قائم کی جائے۔ جس میں سیاستدانوں کی صلاحیتوں کو صیقل...... پالش...... کرنے پر محنت کی جائے جو اس ادارے کے معیار پر پورا اترے اسے ہی اقتدار کی راہداریوں میں داخل ہونے دیا جائے، یا پھر انتخابات میں کامیاب ہونے کی امیدوار مقابل جماعتیں اپنی ضمنی...... شیڈو...... کابینہ منتخب کر کے اپنے کارکنوں کو حسب صلاحیت محکموں کے افسران کے زیر تربیت رکھنے کو معمول بلکہ اقتدار کے لیے شرط رکھ دی جائے تاکہ وہ ہمیشہ ہی کلرک بادشاہوں اور اپنے سیکرٹریوں کے مرہون منت نہ رہیں انھیں خود بھی کچھ عقل، تجربہ، اصطلاحات اور محکمانہ نشیب وفراز سے آگاہی ہو جائے وگرنہ جو حکم ران جاگیردار ہوگا وہ عوام کو مزارع، صنعت کار مزدور، مذہبی راہ نما، مرید، نیاز منداور ہر جماعت کا سربراہ اپنا کارندہ گمان کرتے ہوئے عوام کو کالانعام جانتے ہوئے ان سے اپنے شعبے کے مطابق سلوک کرے گا۔

درس قرآن

قسط نمبر ۵۹

تفسیر سورۃ الصّٰفّٰت

مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

﴿فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ﴾ تو ہم نے اسے ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ ''غلام'' اس لڑکے کو کہتے ہیں جس کی مَسیں بھیک چکی ہوں، عمر دس سال سے زائد ہو اور بلوغت کے قریب ہو۔ شیر خواری اور پرورش کے مراحل میں بچے کو ''طفل'' کہتے ہیں۔ دس سال سے عمر کم ہو تو ''صبی'' کہتے ہیں۔ جب بالغ ہو جائے تو ''شاب'' کہتے ہیں۔ جب بیس سے تیس سال کی عمر ہو ''رجل'' کہتے ہیں۔ جب تیس سے چالیس کی عمر ہو تو ''کہول'' (ادھیڑ عمر والا) کہتے ہیں۔ چالیس سے ساٹھ سال عمر ہو تو ''شیخ'' کہتے ہیں۔ اس سے اوپر ستر اسی سال یا اس سے زائد عمر ہو تو اسے ''شیخ فانی'' کہتے ہیں۔

﴿حلیم﴾ اس کے معنی بردبار، تحمل و وقار، جلدی نہ کرنے والا، نرم دل رکھنے والا، مرضی کے خلاف کام ہو جائے تو نہ گھبرائے نہ ہی غضب و غصے میں آئے۔ بیٹے کا یہ وصف مُشعِر ہے کہ وہ بڑا ہو گا کیوں کہ گود میں پڑے بیٹے کو ان اوصاف سے متصف نہیں کیا جاتا۔

''الحلیم'' اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک اسم مبارک ہے۔ امام قتادہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وصف حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند ارجمند علیہما السلام کے بارے میں ہی بیان کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾[التوبة: ١١٤]

''بے شک ابراہیم یقیناً بہت نرم دل، بڑا بردبار تھا۔''

نیز فرمایا:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾[هود: ٧٥]

''بے شک ابراہیم تو نہایت بردبار بہت آہ و زاری کرنے والا، رجوع کرنے والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کے فرزند کا یہی وصف اس بات کا مُشعِر ہے جیسے ابراہیم نرم دل اور بردبار تھے ان کا فرزند بھی انھی اوصاف سے متصف ہو گا۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے نار نمرود کے وقت تمکنت و وقار کا مظاہرہ کیا اور ان کے سکونِ قلب میں کوئی اضطراب پیدا نہیں ہوا، اسی طرح ان کے فرزند کو بھی قربانی کی بات سن کے کوئی قلق نہ ہو گا اور ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ بات سنتے ہی پکار اٹھیں گے: ابا حضور! جس کا حکم ملا اس پر عمل کیجیے آپ مجھے صابر پائیں گے۔ یہاں بشارت حرف ''فا'' کے ساتھ ہے جس میں اشارہ ہے کہ یہ بشارت دعا کی قبولیت کے نتیجے میں ہے۔ جب کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت ''وبشروہ'' کے لفظ سے ہے جیسا کہ سورۃ الذاریات (آیت: ۲۸) میں ہے۔ اور یہ بشارت مزید انعام و اکرام کے طور پر ہے۔

یہ بیٹا کون تھا؟

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حضرت عکرمہ اور قتادہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ اور وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو ہی ذبیح قرار دیتے ہیں۔ یہی قول بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ ''اہل علم کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں یہ قول سلف کی ایک جماعت سے منقول ہے اور بعض صحابہ سے بھی یہ مروی ہے۔ لیکن اس باب میں کتاب و سنت سے کوئی بات ثابت نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ان تمام روایات کا ماخذ علمائے اہل کتاب ہیں۔ انھی

سے یہ روایت بغیر کسی دلیل و برہان کے قبول کر لی گئی ہے۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید شاہد ہے اور راہ نمائی کرتی ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔'' (ابن کثیر: ۴/ ۲۰)

بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول بھی منقول ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ یہود حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح کہتے ہیں مگر یہود کا یہ قول بالکل جھوٹ ہے۔

بلکہ ہم تورات (کتاب پیدائش، ب: ۱۶) کے حوالے سے پہلے نقل کر آئے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے وقت چھیاسی سال تھی اور پیدائش ب ۲۱ آیت ۵ میں ہے:

''جب اس کا بیٹا اسحاق اس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔''

بلکہ تورات ہی کا بیان ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی گئی تو اُنھوں نے فرمایا:

''کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے، جو نوّے برس کی ہے، اولاد ہوگی۔ اور ابرہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔''

(پیدائش، ب: ۱۷، آیت: ۱۷، ۱۸)

جس سے نصف النہار کی طرح ظاہر ہوتا ہے براہیم علیہ السلام کے پہلے بیٹے اسماعیل علیہ السلام تھے اور وہی اکلوتے بیٹے تھے۔ مگر یہود کی تحریف اور بے خبری کی انتہا ہے کہ اسی کتاب میں ہے:

''خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اسے کہا اے ابراہام! اس نے کہا میں حاضر ہوں، تب اس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اسحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔''

(پیدائش، باب: ۲۲، آیت: ۱، ۲)

غور فرمایئے! یہاں اکلوتا بیٹا اسحاق علیہ السلام قرار دیے گئے ہیں، حافظ ابن کثیر نے بھی فرمایا ہے کہ یہود نے اسحاق علیہ السلام کا نام جھوٹ موٹ لکھ دیا اور یہ ان کی کتاب کی نص کے خلاف ہے کہ اسماعیل اکلوتے بیٹے تھے۔ انھی کا یہاں وصف حلیم بیان ہوا ہے جب کہ سورت ذاریات (آیت: ۲۸) میں حضرت اسحاق علیہ السلام کا وصف ایک صاحب علم بیٹے کی حیثیت سے ہے:

﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾

''اور اُنھوں نے اسے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی۔''

سورۂ ہود میں تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ پوتے یعقوب علیہ السلام کی بشارت بھی ہے۔ اس لیے اکلوتے بیٹے ''اسحاق'' کے ذبح کا حکم بے معنی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دونوں بیٹے بڑھاپے میں ملے تھے اور وہ اسی ترتیب سے اللہ کے شکر گزار ہیں:

''سب تعریف اس اللہ کی ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحاق عطا کیے بے شک میرا رب تو بہت دعا سننے والا ہے۔'' (ابراہیم: ۳۹)

آئندہ آیت نمبر ۱۱۲ میں ذبحِ اسماعیل کے بعد بشارتِ اسحاق بھی اسی حقیقت کی غماز ہے۔ (مزید دیکھیے: زاد المعاد: ۱/ ۷۱، ۷۲ الحاوی للفتاوی: ۱/ ۳۱۸-۳۲۲)

اس موضوع پر مولانا حمید الدین فراہی مرحوم نے ''الــــرأي الصحيح في من هو الذبيح'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو ہر اعتبار سے اس بحث کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ البتہ اس کے بعض ضمنی مباحث محل نظر ہیں۔ اس کا ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا ہے۔ شائقین تفصیل کے لیے یہ رسالہ ملاحظہ فرمائیں ہم نے چند بنیادی باتیں عرض کر دی ہیں۔ والحمد للہ علی ذٰلک۔

حدیث ((أنا ابن الذبيحين)):

بعض مفسرین نے یہاں ابن عساکر وغیرہ سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((انا ابن الذبيحين .))

''میں دوذبیحوں کا بیٹا ہوں۔''

یہ روایت تاریخ دمشق (۶/ ۲۰۵) اور المستدرک (۲/۲۵۴) وغیرہ کتب میں منقول ہے۔آپ ﷺ واقعی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فرزند ہیں مگر یہ الفاظ آپ ﷺ سے کسی قابل اعتبار سند سے مروی نہیں ہیں ۔ علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں کہا ہے: ''إسناده واه''اس کی سند واہ ہے۔اور علامہ سیوطی نے کہا ہے:هذا حديث غريب و فی اسناده من لا يعرف . '' ''یہ غریب حدیث ہےاس کی سند میں ایساروی ہے جو پہچانا نہیں جا تا۔''(الحاوی للفتاوی:۱/ ۳۱۹،الفتاوی القرآنیہ)

حافظ ابن کثیر نے بھی فرمایا ہے کہ یہ حدیث ''غریب جدا'' ہے۔(تفسیر:۴/ ۲۵)

شیخ البانی نے الضعیفۃ (رقم:۳۳۱اور۱۶۷۷) میں تفصیلاً اس پر نقد کیا ہےاور فرمایا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔



خلاصہ تراویح اور دعاؤں کے کتابچے مفت حاصل کریں

ماہِ رمضان المبارک کی مناسبت سے ایک کتابچہ ''ہم نے آج تراویح میں کیا پڑھا'' اردو اور سندھی زبان میں تراویح کے دوران روزانہ پڑھے جانے والے قرآن کریم کے حصے کا خلاصہ مع بنیادی مسائل و دیگر معلومات اور ''قرآنی ومسنون دعائیں'' مع آسان ترجمہ مفت تقسیم کی جارہی ہیں۔ان کتب کے حصول کے خواہش مند خواتین وحضرات عام ڈاک کے لیے کم ازکم ۱۵ روپے اور ارجنٹ میل سروس کے لیے ۵۵ روپے کے ڈاک ٹکٹ بنام ڈاکٹر ممتاز عمر T-473، کورنگی نمبر 2، کراچی ۔ 74900 کے پتے پر روانہ کرکے کتابچے حاصل کرسکتے ہیں۔



بقیہ : قرآن میں مذکور رنگ

''اور قیامت کے دن تُو دیکھے گا کہ وہ لوگ جنھوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا،ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔''

یعنی اللہ کو جھٹلانے کی سزا یہ ملے گی کہ کافروں کے منہ کالے کردیے جائیں گے۔

الحمر:

الحمر سے سرخ رنگ مراد ہے اور ''الموت الاحمر'' اُس موت کو کہتے ہیں جو سخت خونریزی کے بعد واقع ہو۔

نیز پہاڑوں کی رنگت کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا﴾ [الفاطر:۲۷]

''اور پہاڑوں میں سے کچھ سفید اور سرخ قطعے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔''

ازرق،زرقا:

اس سے نیلاہٹ مراد ہے۔وہ رنگ جو سپیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے:

"زرقت عينه زرقة ."

یعنی اُس کی آنکھ نیلی ہوگئی۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا﴾ [طٰهٰ:۱۰۲]

''جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔''

یعنی دہشت کے باعث مجرم نیلگوں ہورہے ہوں گے۔اور طبّی اعتبار سے بھی خون کی گردش تھمنے سے جسم نیلا پڑ جاتا ہے۔جب کہ علامہ زمخشری کے مطابق زرقا سے مراد اندھے ہیں جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو،چنانچہ لکھتے ہیں:

"ان المراد العمى لان حدقة من يذهب نور بصره تزراق ." (الکشاف : ۳/ ۸۸)

درسِ حدیث

صحیح بخاری کی آخری حدیث پر درس

شیخ الحدیث مفتی عبید اللہ خان عفیف حفظہ اللہ

امام الدنیا فی الحدیث، رئیس الفقہاء، امیر المومنین فی الحدیث، شیخ الاسلام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ کی ولادت ۱۳ شوال ۱۹۴ھ جمعہ کی نماز کے بعد ہوئی۔ اور وفات عیدالفطر کی رات نماز عشاء کے بعد بہ عمر ۶۲ برس ۲۵۶ھ میں ہوئی۔ کسی شاعر نے امام بخاری کی تاریخ ولادت، مدت عمر اور تاریخ وفات کو یوں نظم کیا ہے ؎

كان البخاري حافظا و محدثا
جمع الصحيح مكمل التحرير
ميلاده صدق ومدة عمره
فيها حميد وانقضى في نور

(صدق = ۱۹۴، حمید = ۶۲، نور = ۲۵۶)

اساتذہ:

آپ کے اساتذہ میں مندرجہ ذیل کبار ائمہ کرام کا نام نظر آتا ہے:
امام احمد بن حنبل، محمد بن بشار، علی بن مدینی، اسحاق بن راہویہ، قتیبہ بن سعید، محمد بن سلام بیکندی، مکی بن ابراہیم، یحییٰ اور محمد بن سنان، عبیداللہ بن موسیٰ، زہیر بن حرب اور احمد بن اشکاب وغیرہم۔

اخذ حدیث میں احتیاط:

امام بخاری فرماتے ہیں:
"كتبت الحديث عن الف وثمانين ليس فيهم الا صاحب الحديث ."
''میں نے ایک ہزار اسی اساتذہ سے حدیث لکھی ہے، وہ سب کے سب اہل حدیث تھے۔'' (یعنی سب کا عقیدہ اہل حدیث والا تھا)

مزید فرماتے ہیں:
"لم اكتب الحديث الا عمن قال الايمان قول وعمل ."
یعنی میں نے انھی لوگوں کی حدیث قبول کی ہے جو ایمان کو مرکب ثلاثی مانتے تھے کہ ایمان افعال قلوب، افعال لسان اور افعال جوارح کے مجموعے کا نام ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ میرے شیوخ اور اساتذہ میں کوئی بھی مرجی اور بدعتی نہیں بلکہ وہ سب کے سب اہل الحدیث اور اہل سنت تھے۔

صحیح بخاری اور دیگر تصانیف:

یوں تو آپ تقریباً بیس علمی اور مفید ترین کتابوں کے مولف اور مصنف ہیں جن میں سے کتاب برالوالدین، الادب المفرد (معاشرتی مسائل کے موضوع پر)، جزء رفع الیدین، جزء القراءۃ، رسالہ خلق افعال العباد (بندوں کے افعال مخلوق ہیں)، التاریخ الصغیر، التاریخ الکبیر (نو جلدوں میں) دستیاب ہیں۔

التاریخ الکبیر کو امام اسحاق بن راہویہ جادو کہتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ بخارا کے حاکم کو کہا: میں تمھیں جادو دکھاؤں؟ اس نے کہا دکھایئے۔ تو امام اسحاق نے التاریخ الکبیر پیش کر دی۔ اس کتاب میں علم حدیث کے متعلق بڑے علمی جواہر پارے، تحقیقی خزف ریزے، قیمتی معلومات اور بڑا مفید مواد موجود ہے۔ مگر بہ ایں ہمہ سب سے زیادہ مشہور اور مقبول عام کتاب صحیح بخاری کو حاصل ہے۔

صحیح بخاری کا مکمل نام:

اس کا مکمل نام درج ذیل ہے:

"الجامع المسند الصحيح المختصر من امور رسول الله ﷺ و سننه وایامه ."

(علوم الحديث لابن صلاح)

حافظ ابن حجر نے اس کا نام یوں ذکر فرمایا ہے:

"الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول الله ﷺ و سننه وایامه." (هدی الساری)

ان دونوں ناموں میں معمولی فرق ہے۔ دونوں کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے۔ اس مفصل نام سے پتا چلا کہ کتاب کا موضوع صحیح اور مسند حدیث ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اصول حدیث، اصول فقہ کے بعض مسائل اور بعض احادیث میں بہ ظاہر تعارض ہے، اس کا حل تراجم ابواب میں فرما دیا ہے۔ یہ کتاب ''جامع'' ہے یعنی اس میں عقائد، اعمال، احکام، آداب، سیر، فتن، اشراط اور تفسیر، آٹھ قسم کی احادیث جمع فرمادی ہیں۔ اس وقت کے بدعتی فرقوں اوران کے عقائد فاسدہ کا رد بھی کیا گیا ہے، چنانچہ روافض کا رد کتاب الاحکام میں، خوارج کا رد کتاب الفتن میں اور مرجیہ، جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ کا مکمل رد کتاب التوحید میں بڑے سنجیدہ علمی اسلوب اور حکیمانہ انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس علمی لحاظ سے یہ کتاب گویا انسائیکلو پیڈیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور آپ کے نفوس پاکیزہ کا عکس ہے۔

اندراج حدیث میں بے مثال احتیاط کی جھلک:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کتاب کی تالیف اور جمع میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور اتنی احتیاط کو پیش نگاہ رکھا ہے کہ اس سے زیادہ احتیاط کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ کتنی محنت اور احتیاط کی ہے، سنیے! آپ کے آخری شاگرد محمد بن عمر بن مطر فربری فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ماوضعت فی الکتاب حدیثا الا اغتسلت قبل ذلك وصلیت رکعتین ."

''میں نے اپنی اس کتاب میں ہر حدیث لکھنے سے قبل غسل کیا اور دو رکعت نماز ادا کی۔''

آپ کے دوسرے شاگرد عمر بن محمد بن بجیر البجیری کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا:

"ما ادخلت فی الصحیح حدیثا الا استخرت الله وصلیت رکعتین وتیقنت صحته ."

''میں نے اپنی کتاب ''صحیح'' میں ہر حدیث درج کرنے سے پہلے اللہ سے استخارہ کیا، دو رکعت نماز ادا کی اور حدیث کے صحیح ہونے کا یقین حاصل کیا، پھر اُسے درج کتاب کیا۔''

بہ لحاظ صحت اور تدریس قبول عام:

اللہ تعالیٰ نے حسن نیت، مخلصانہ قلم اور پاک باز، پاک نہاد ہاتھ سے تیار ہونے والی تالیف کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اتنا قبول عام بخشا ہے کہ اس دور کے نابغہ روزگار محدثین یہ کہنے پر متفق ہیں:

"ما أظلت الخضراء ولا اقلت الغبراء بعد کتاب اللّٰه الباری کتابا أصح من صحیح البخاری ."

یعنی زمین کے سینے پر اور آسمان کی چھت تلے قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔

اور جو قبول عام اسے بہ لحاظ تدریس حاصل ہوا، وہ آپ حضرات کے سامنے ہے کہ خود امام بخاری سے پڑھنے والوں کی تعداد نوے ہزار ہے۔ اور اب تو کروڑوں سے متجاوز ہے ؎

نہ جانے تجھ میں کیا ہے کہ لوٹے ہے تجھ پہ جی
یوں اور کوئی جہاں میں حسین ہی نہیں

صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد:

بہ قول حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ احادیث کی تعداد (۷۲۷۵) ہے اور بلاتکرار چار ہزار۔ اور بہ قول مولانا داود راز رحمہ اللہ تعداد (۷۵۶۳) ہے۔

مگر حافظ ابن حجر کی گنتی کے مطابق یہ دونوں اعداد وشمار درست نہیں بنتے۔ ان کے شمار کے مطابق تعداد (۹۰۸۲) ہے۔ اور بلاتکرار

(۲۵۱۳) ہے۔ حافظ ابن حجر کے مطابق صحیح بخاری میں کتابوں کی تعداد ایک ہزار ہے اور ابواب چار ہزار ہیں۔

حافظ ابن حجر نے الجامع الصحیح کی احادیث کو تین دفعہ شمار کیا ہے اور بڑی دیدہ ریزی سے شمار کیا ہے:

پہلے کتاب وار، مثلاً: باب بدء الوحی میں سات، کتاب الایمان میں اکیاون، کتاب العلم میں پچھتر، کتاب الوضوء میں ایک صد پندرہ، وغیرہ۔

پھر صحابی وار، مثلاً: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بائیس، عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ساٹھ، عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے نو، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے انتیس۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے دو صد سترہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پچاسی، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نوے، انس رضی اللہ عنہ سے دوصد سترہ، عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے چھبیس، عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوصد بیالیس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دوصد ستر احادیث شمار کی ہیں۔

اور پھر تیسری دفعہ ہر کتاب کے آخر میں حدیثوں کو شمار کیا ہے اور تعداد تحریر کی ہے۔ لہٰذا فتح الباری کے آخر میں جو تعداد لکھی ہے وہ مع مکررات (۹۰۸۲) ہے۔ اور بلاتکرار (۲۵۱۳) ہے۔ اگرچہ حافظ ابن حجر نے یہ میزان بڑی دیدہ ریزی اور بالغ نظری سے لگایا ہے۔ پھر بھی انسان کی محنت کی حد تک ہے اس میں کمی اور غلطی کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن صلاح والی میزان (۷۲۷۵) بہ ہر حال درست نہیں۔

فواد عبدالباقی نے فتح الباری میں حدیث التسبیح (آخری حدیث) پر جو ترقیم لکھی ہے وہ (۷۵۶۳) ہے۔

حدیث التسبیح (آخری حدیث):

حدیث التسبیح صحیح بخاری میں تین مقامات پر مروی ہے۔

آخری حدیث پر امام بخاری نے بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:

"باب قول الله تعالى ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ وان اعمال بني آدم و قولهم يوزن...... الخ۔"

یہ صحیح بخاری کی آخری کتاب "کتاب التوحید" کا آخری باب ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے دور میں چار بڑے گمراہ اور بدعتی فرقے وجود پکڑ چکے تھے: خوارج، روافض، جہمیہ، قدریہ وغیرہ۔ خوارج کا رد کتاب الفتن میں اور روافض کا رد کتاب الاحکام میں کر چکے، اب اس آخری باب میں جہمیہ، قدریہ اور معتزلہ کا رد مقصود ہے۔ اس باب کا کتاب التوحید کے ساتھ بھی تعلق ہے اور پوری کتاب کے ساتھ بھی تعلق ہے۔

کتاب التوحید کے ساتھ تعلق: کتاب التوحید میں اللہ تعالیٰ کی صفات، ہاتھ، چہرہ، سمع، بصر اور ساق کا تذکرہ ہے جس کا جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ انکار کرتے ہیں، امام بخاری ان کا رد کر رہے ہیں۔ اس آخری باب سے پہلے باب "قراءة الفاجر والمنافق واصواتهم" میں اللہ کی جو صفت بیان ہوئی ہے کلام الٰہی ہے۔ جہمیہ اور معتزلہ اللہ کی صفت "کلام" کے منکر ہیں۔ امام بخاری یہاں ان کے غلط شبہات کا رد کر رہے ہیں۔

شبہ انھیں یہ ہوا کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو انسان کے کلام پر قیاس کیا اور پہلے اپنے دماغ میں اللہ کے کلام کو انسان کے کلام کے ساتھ تشبیہ دے لی، پھر تشبیہ دے کر جب دیکھا کہ بات بنتی نہیں کیوں کہ اللہ کا کلام انسان کے کلام جیسا ہے ہی نہیں، تو انکار کر دیا۔

امام بخاری کلام الٰہی اور کلام انسان میں فرق ثابت کر رہے ہیں:

(۱)...... اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے جب کہ انسانی کلام مخلوق ہے، لہٰذا جہمیہ اور معتزلہ نے اپنے دماغ میں جو تشبیہ دی ہے تو یہ تشبیہ ہی غلط ہے۔ اگرچہ جہمیہ اور معتزلہ پرانے فرقے ہیں اب ان کے نام تو نہیں ہیں، البتہ ان کے عقائد فاسدہ کے حاملین اب بھی موجود ہیں۔ یہ لوگ کلام نفسی کے قائل ہیں۔ یہ قائلین کلام نفسی جہمیہ اور معتزلہ سے متاثر ہیں اور انھی کے زلہ خوار اور پیرو کار ہیں۔

شاہ ولی اللہ کلام نفسی کے قائلین پر چوٹ کرتے ہوئے فرماتے

ہیں کہ ’’کلام نفسی کا قول کلام الٰہی کی نفی کے مترادف ہے۔‘‘ تا کہ انکار کا فتویٰ نہ لگے کہ ہم مانتے ہیں اللہ متکلم ہے لیکن بکلام النفسی، ہم نے اللہ کے متکلم ہونے کا انکار تو نہیں کیا۔

مگر انھیں کون سمجھائے کہ کلام نفسی تو گونگے کے اندر بھی موجود ہے۔ کیا کوئی اس کو متکلم کہتا ہے۔ کلام نفسی تو اس کے نفس کے اندر موجود ہے۔ اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کو گونگا قرار دیتے ہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ سچ مچ متکلم ہے اور اس کے کلام میں حروف بھی ہیں اور آواز بھی ہے، جیسے فرمایا:

٭.....﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْماً﴾ [النساء: ١٦٤]

’’اور اللہ نے موسیٰ سے خود کلام کیا۔‘‘

٭.....﴿وَنٰادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ﴾ [مريم: ٥٢]

’’اور ہم نے اسے پہاڑ کی دائیں جانب سے آواز دی۔‘‘

٭.....﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾[الشورىٰ:٥١]

’’اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے۔‘‘

معراج کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کلام کیا، جیسے فرمایا:

” لا يبدل القول لدي . “

’’میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی۔‘‘

بہ ہر حال ایک فرق تو یہ ہوا کہ اللہ کا کلام غیر مخلوق اور انسانی کلام مخلوق ہے۔

(۲)......اللہ کا کلام ازلی اور ابدی ہے، انسان کا کلام نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا جس میں اللہ تعالیٰ متکلم نہ تھا اور نہ ایسا وقت کبھی آئے گا کہ متکلم نہ رہے۔ کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے:

٭.....﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾[البقرة:٢٥٥]

’’اسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ۔‘‘

٭.....﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۝﴾[الفرقان:٥٨]

’’اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں کی پوری خبر رکھنے والا کافی ہے۔‘‘

جب اونگھ نہیں اور نیند نہیں تو موت کہاں۔ مگر بچہ پیدائش کے وقت متکلم نہیں ہوتا بعد میں متکلم ہوتا ہے۔ انسان پیدائش کے وقت کلام نہیں کرتا۔ پہلے یہ موجود ہی نہ تھا کلام کیسے کرتا:

﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا ۝﴾[الدهر:١]

’’کیا انسان پر زمانے مین سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو؟‘‘

حضرت زکریا کے بارے میں فرمایا:

﴿وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا﴾[مريم:٩]

’’اور یقیناً میں نے تجھے اس سے پہلے پیدا کیا جب کہ تُو کچھ بھی نہ تھا۔‘‘

پھر زندہ اور موجود ہونے کے باوصف انسان کلام پر قادر نہیں رہتا، مثلاً: غشی اور مفلوج ہونے کی حالت میں کلام نہیں کر سکتا۔ اور پھر موت کے بعد متکلم نہیں رہتا، زبان ہی بند ہو گئی کلام کیسے کرے گا۔ یہ دوسرا فرق ہے کہ اللہ کا کلام ازلی اور ابدی ہے جب کہ انسان کا کلام نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔

(۳)...... اللہ کا کلام غیر موزون ہے یعنی اس کا وزن نہیں کیا جا سکتا۔ جب کہ انسان کا کلام موزون ہے اس کا وزن کیا جائے گا۔

کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((کلمتان حبیبتان الی الرحمان خفیفتان علی اللسان ثقلیتان فی المیزان......إلخ .))

''دو کلمے رحمان کو محبوب، زبان پر ہلکے اور میزان میں بڑے وزنی......الخ۔''

یعنی دو کلمے میزان میں بھاری اور بوجھل ہوں گے، یعنی ان کا وزن ہوگا، لہٰذا انسان کا کلام موزون ہے۔

کتاب التوحید کے ساتھ تعلق اس بنتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کا بیان ہے تو یہاں بھی اللہ کی ایک صفت ''وزن کرنے والا'' بیان کی گئی ہے:

❁ ......﴿ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝﴾[الانبیاء: ٤٧]

''اور ہم قیامت کے دن ایسے ترازو رکھیں گے جو عین انصاف ہوں گے، پھر کسی شخص پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے ایک دانے کے برابر عمل ہوگا تو ہم سے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔''

❁ ......﴿وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ۝﴾[الاعراف: ٨، ٩]

''اور اس دن وزن حق ہے، پھر وہ شخص کہ اس کے پلڑے بھاری ہو گئے تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔ اور وہ شخص کہ اس کے پلڑے ہلکے ہو گئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو خسارے میں ڈالا، اس لیے کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔''

تو وزن کس نے کرنا ہے، اس لیے وزن کرنا اللہ کی صفت ہے، لہٰذا اس حدیث کا کتاب التوحید کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

پوری کتاب کے ساتھ تعلق: اور وہ اس طرح کہ اس حدیث کے اندر میزان کا ذکر ہے۔ امام بخاری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابیں میزان ہیں۔ انسانوں کے اقوال و اعمال کو ان پر پیش کیا جائے گا جو قول و عمل کتاب و سنت کے مطابق ہوگا وہ صحیح اور صواب ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط اور خطا۔ یہ پوری کتاب کے ساتھ تعلق ہے۔

امام بخاری کی عادت ہے کہ کبھی باب کے شروع میں بسا اوقات آیت ذکر کر دیتے جیسے:

''باب قوله تعالى ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[التوبة: ٥]''

اور کبھی باب میں حدیث ذکر کر دیتے ہیں جیسے:

''باب قول النبی ﷺ:((بنی الاسلام علی خمس .))''

اسی طرح یہاں بھی سورت انبیاء کی آیت ﴿ وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ......إلخ ﴾[الانبیاء: ٤٧] ذکر کی ہے کہ قیامت کے روز انصاف کیا جائے گا چھوٹی موٹی نیکی کی بھی جزا اور برائی کی بھی سزا ملے گی، یعنی نیکی اور بدی حاضر کی جائے گی۔

اعتراض:

''موازین'' جمع موصوف اور ''القسط'' صفت واحد ہے۔ موافقت بین الموصوف والصفۃ نہیں۔

جواب:

(۱)......القسط مصدر ہے جو بہ یک وقت واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً: المیزان القسط ، المیزانانِ القسط اور الموازین القسط .

(۲)...... یہاں ذات یا ذوات کا لفظ محذوف ہے جو مضاف ہے

عبارت گویایوں ہے:ن ضع الموازین ذات القسط یا ذوات القسط ،یعنی انصاف والے ترازو۔

(۳)...... یہاں ''القسط'' مفعول لہ ہے ۔معنی یہ ہوگا کہ ہم انصاف کی خاطر ترازو رکھیں گے۔

مفعول لہ کی صورت میں پھر سوال انگڑائی لیتا ہے کہ مفعول لہ نکرہ ہوتا ہے جب کہ ''القسط'' معرفہ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک عام قاعدہ ہے، ورنہ مفعول لہ کے لیے نکرہ ہونا کوئی ضروری نہیں کیوں کہ یہ معرفہ بالاضافۃ بھی آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ﴾[البقرة:١٩]

''وہ کڑکنے والی بجلیوں کی وجہ سے موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔''

یہاں﴿حَذَرَ الۡمَوۡتِ﴾مفعول لہ معرفہ ہے۔اور کبھی معرف باللام بھی آجاتا ہے، شاعر کہتا ہے۔

لا اقعد الجبن عن الهيجاء
ولو توالت زبر الاعداء

﴿لِيَوۡمِ الۡقِيَامَةِ﴾ میں لام تعلیل کے لیے ہے۔ یعنی ''لاجل حساب یوم القيامة .'' (یوم قیامت حساب کے لیے ترازو رکھیں گے)

بعض کے نزدیک یہ لام توقیت کے لیے ہے، جیسے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ﴾[بنی اسرائیل:٧٨]

''ای وقت دلوك الشمس ''تو یہاں بھی ''وقت یوم القيامة''۔اور بعض کے نزدیک یہ لام فی کے معنی میں ہے "ای فی یوم القيامة"

امام بخاری نے آیت﴿ وَ نَضَعُ الۡمَوَازِيۡنَ الۡقِسۡطَ......إلخ﴾ درج کرنے کے بعد فرمایا:"وإن اعمال بنی آدم وقولهم توزن ." یہاں ''یوزن'' بھی صحیح ہے کہ لفظ قول جنس ہے جو واحد، تثنیہ اور جمع کے لیے آجاتا ہے۔ایک دوسرے نسخے میں اقوالهم ہے اور سیاق وسباق کے پیش نظر اقوالهم زیادہ مناسب ہے کیوں کہ پہلے اعمالهم ہے۔

منکرین وزن اعمال کا رد:

یہاں لوگوں کے فاسد نظریے کا رد کرنا مقصود ہے جو وزن اعمال کے منکر ہیں۔ جو کہتے ہیں اقوال اور اعمال اعراض ہیں۔ان کا وجود اور جسم نہیں یعنی جوہر نہیں جب کہ وزن کے لیے موزون چیز کا جوہر جسم اور وجود ہونا ضروری ہے۔جب یہ اعراض ہیں تو ان کا وزن کیسے ہوگا؟

یہ اعتراض بھی تشبیہ پر مبنی ہے ۔اُنھوں نے اُمور آخرت کو اُمور دنیا پر قیاس کرلیا ہے کہ آخرت والا ترازو بھی کریانہ مرچنٹ پر پڑے ہوئے ترازو کے مانند ہوگا۔ یہ ان کی پہلی غلطی ہے اور دوسری غلطی یہ کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں تولنے والے انسان پر قیاس کرلیا ہے کہ جس طرح کوئی انسان غیر جسمی چیز کو تول نہیں سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اعراض (اعمال) کو تولنے سے قاصر رہے گا۔حالانکہ ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ﴾ اللہ کی صفت ہے۔مزید برآں جدید سائنس نے ہوا اور بخار کی مقدار اور وزن معلوم کرلیا ہے۔

اعمال بنی آدم (آدم کے بیٹوں کے اعمال) سے صرف مرد ہی نہیں عورتیں (بنات آدم) بھی مراد ہیں اور شامل حساب ہیں، ان کے اعمال کا بھی وزن ہوگا۔ یہاں قمرین، شمسین ،مشرقین اور مغربین کے قاعدے کے غلبہ کے مطابق بنو آدم کہہ دیا ہے۔جیسے ﴿ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى﴾ کے خطاب بنات آدم بھی مخاطب ہیں۔

بلکہ جنوں کے اعمال کا بھی وزن ہوگا۔جیسے فرمایا:

❁......﴿وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ۝﴾ [الذاريات: ٥٦]

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

❁……﴿يَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا﴾ [الرحمٰن:۳۳]

''اے جن و انس کی جماعت! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔''

❁……﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾ [الطور:١٤]

''یہ ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے۔''

❁……﴿يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝﴾ [الرحمٰن:٤٤]

''وہ اس کے درمیان اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر کاٹتے رہیں گے۔''

وزن اعمال کی کیفیت:

(۱)۔بعض اہل علم کے نزدیک اعمال کو جسم دیا جائے گا اور ان کا وزن ہوگا۔

(۲)۔بعض کے نزدیک اصحاب الاعمال کا وزن ہوگا۔

(۳)۔بعض کہتے ہیں: صحائفِ اعمال کا وزن ہوگا، جیسے حدیث بطاقہ ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی یہی رائے ہے۔

مگر صحیح یہ ہے کہ اعمال کا وزن ہوگا:

①……ابودرداء کی حدیث ابوداود، ترمذی، ابن حبان (وصححہ) میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((ما يوضع في الميزان يوم القيامة اثقل من خلق حسن .))

''روز قیامت میزان میں حسن خلق سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔''

②……''عن جابر رفعه: توضع الموازين يوم القيامة فتوزن الحسنات والسيئات فمن رجحت حسناته على سيئاته مثقال حبة دخل الجنة ، ومن رجحت سيئاته على حسناته دخل النار . قيل: فمن استوت حسناته وسيئاته؟ قال: اولئك اصحاب الاعراف .''

''حضرت جابر مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز میزان رکھا جائے گا، پھر نیکیوں اور برائیوں کا وزن کیا جائے گا، پس جس کی نیکیوں کا پلڑا رائی کے دانے کے برابر بھی برائی کے پلڑے سے بھاری ہوگیا، وہ جنت میں داخل ہوگا۔اور جس کی برائیوں کا پلڑا اس کی نیکیوں کے پلڑے سے بھاری ہوگیا، وہ جہنم میں داخل ہوگا۔پوچھا گیا کہ جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوگئیں؟ کہا: یہ اصحاب الاعراف ہوں گے۔''



مجلّہ ''اشاعۃ الحدیث'' حضرو باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

قارئین و احباب کی خدمت میں گزارش ہے کہ مجلّہ ''اشاعت الحدیث'' حضرو ضلع اٹک جس کے بانی محدث العصر حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ تھے۔الحمدللہ حضرت موصوف کی وفات کے بعد مجلّے کی اشاعت بدستور جاری ہے۔حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ کے ساتھی اور ان کے احباب اپنے بھرپور تعاون سے اسے جاری رکھے ہوئے ہیں۔یہ سطور اس لیے تحریر کی جا رہی ہیں کہ بعض لوگوں نے افواہ پھیلا دی کہ مجلّہ اشاعۃ الحدیث بند ہوگیا ہے۔احباب نوٹ فرمالیں کہ مجلّہ جاری ہے اور اللہ تعالیٰ اسے جاری رکھے۔آمین

حافظ ندیم ظہیر، مکتبہ اشاعۃ الحدیث، حضرو ضلع اٹک



ارکانِ اسلام

قسط نمبر ② آخری

روزہ؛ احکام وفضائل اور اعمال

عبدالرشید عراقی

اعتکاف:

رمضان المبارک کے آخری عشرے کے اعمال میں سے ایک عمل اعتکاف بھی ہے اعتکاف کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ یک سو ہو کر اور سب سے منقطع ہو کر کسی جامع مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر واذکار اور اس کے حضور مناجات کرے۔ یہ خاص الخاص بلکہ اخص الخاص کی عبادت ہے۔

رسول اللہ ﷺ اہتمام سے ہر سال رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے تھے۔ بلکہ ایک سال کسی وجہ سے آپ ﷺ کا اعتکاف رہ گیا تو اگلے سال آپ ﷺ نے دو عشروں کا اعتکاف فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"ان النبی ﷺ کان یعتکف العشر الأواخر من رمضان حتی توفاہ اللہ، ثم اعتکف ازواجہ من بعدہ."

(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

''رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے۔ وفات تک آپ ﷺ کا یہ معمول رہا۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اہتمام سے اعتکاف کرتی رہیں۔''

جامع ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے ایک سال آپ ﷺ اعتکاف نہیں کر سکے تو اگلے سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔''

(بہ حوالہ معارف الحدیث: ۱۲۰/۴)

اعتکاف، رمضان کے فوائد اور مقاصد کی تکمیل کے لیے ہے۔ اگر روزے دار کو رمضان کے پہلے حصے میں وہ سکون قلب، جمعیت باطنی، فکر و خیال کی مرکزیت، انقطاع الی اللہ کی دولت، رجوع الی اللہ کی حقیقت اور اس کے در رحمت پر پڑے رہنے کی سعادت حاصل نہیں ہو سکی تو اس اعتکاف کے ذریعے اس کا تدارک کر سکتا ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:

''اعتکاف کی روح اور اس کا مقصود یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے اور اس سے جمعیت باطنی حاصل ہو۔ اشتغال بالخلق سے رہائی نصیب ہو اور اشتغال بالحق کی نعمت میسر آئے۔ اور یہ حال ہو جائے کہ تمام افکار و تر ددات اور ہموم و وساوس کی جگہ اللہ کا ذکر اور اس کی محبت لے لے۔ ہر فکر اُس کی فکر میں ڈھل جائے اور ہر احساس و خیال اس کے ذکر و فکر اور اس کی رضا و قرب کے حصول کی کوشش کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ مخلوق سے اُنس کے بجائے اللہ تعالیٰ سے اُنس پیدا ہو۔ اور قبر کی وحشت میں جب کوئی اس کا غم خوار نہ ہوگا، یہ اُنس اس کا مراد سفر بنے۔ یہ ہے اعتکاف کا مقصد جو رمضان کے افضل ترین دنوں یعنی آخری عشرے کے ساتھ مخصوص ہے۔''

(زاد المعاد: ۱۷۸/۱)

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

''چونکہ مسجد میں اعتکاف جمعیت خاطر، طہارت قلب، ملائکہ سے تشبیہ اور شب قدر کے حصول کا ذریعہ، نیز طاقت وعبادت کا بہترین موقع ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے

اس کو عشرہ اواخر میں رکھا ہے اور اپنی اُمت کے محسنین وصالحین کے لیے اس کو سنت قرار دیا ہے۔''

(حجۃ اللہ البالغہ: ۴۲/۲)

رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہمیشہ مداومت فرمائی اور مسلمانوں نے بھی ہر جگہ اور ہر دور میں اس کی پابندی کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد (م۱۹۵۸ء) فرماتے ہیں:

''ہر مسلم آبادی میں چند نفوس مسلم کے لیے ضروری ہے کہ اواخر عشرہ رمضان میں مسجد کے ایک گوشہ میں شب و روز محویت اتباع نبوی ﷺ، تلاوتِ کتاب عزیز (قرآن) تفکر خلق سماوات وارض، ذکر نعم الٰہی، تذکر اسمائے حسنٰی اور تحیت وتسلیم و ادائے صلات میں اس طرح بسر کریں کہ ان کے اوقاتِ محدود کا کوئی لمحہ تذکر و تفکر سے خالی نہ ہو۔ تاکہ ان اشخاص مقدسہ کا جلوہ اس کی آنکھوں میں پھر جائے۔''

(ارکانِ اسلام، ص: ۲۳۱)

جو شخص اعتکاف کی سعادت حاصل کرے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ روزہ رکھے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ (م۷۲۸ھ) اور حافظ ابن قیم (م۷۵۱ھ) نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

(تیسیر الرحمان لبیان القرآن، ص: ۱۰۴)

اعتکاف جامع مسجد میں کیا جائے۔ اور اعتکاف کی مدت میں بیوی سے جماع جائز نہیں۔ فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

''اعتکاف کی حالت میں بیوی سے مباشرت اور بوس وکنار کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ ملاقات اور بات چیت جائز ہے۔ ﴿عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ سے استدلال کیا گیا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے، مرد ہو یا عورت۔ ازواج مطہرات نے بھی مسجد میں اعتکاف کیا ہے اس لیے عورتوں کا اپنے گھروں میں اعتکاف بیٹھنا صحیح نہیں۔ البتہ مسجد میں ان کے لیے ہر چیز کا مردوں سے الگ انتظام کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مردوں سے کسی طرح کا اختلاط نہ ہو، جب تک مسجد میں معقول، محفوظ اور مردوں سے بالکل الگ انتظام نہ ہو، عورتوں کو مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اور عورتوں کو بھی اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ایک نفلی عبادت ہی ہے۔ جب تک پوری طرح تحفظ نہ ہو اس نفلی عبادت سے گریز بہتر ہے۔ فقہ کا اُصول ہے:

"درأ المفاسد يقدم على جلب المصالح."

''مصالح کے حصول کے مقابلے میں مفاسد سے بچنا اور ان کو ٹالنا زیادہ ضروری ہے۔''

(احسن البيان، ص: ٧٥، ٧٦)

لیلۃ القدر:

جس طرح ماہ رمضان کو دوسرے مہینوں کے مقابلے میں فضیلت حاصل ہے، اسی طرح اس کا آخری عشرہ پہلے دونوں عشروں سے بہتر ہے اور لیلۃ القدر اسی عشرے میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلَٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَٰمٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝﴾ [القدر: ۱-۵]

''بے شک ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر یعنی باعزت اور خیر وبرکت والی رات میں نازل کیا ہے۔ اور آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس رات میں فرشتے اور جبریل روح الامین اپنے رب کے حکم سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں۔ وہ رات سلامتی والی ہوتی ہے طلوع فجر تک۔''

لیلۃ القدر کے بارے میں علمائے کرام کے چالیس سے زیادہ

اقوال ہیں۔ سب سے قوی روایت یہ ہے کہ یہ رات رمضان کی آخری دس راتوں میں آتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((تحروا ليلة القدر فی الوتر من العشر الاواخر من رمضان .)) (صحيح بخاری، صحيح مسلم ، جامع ترمذی، مسند احمد)

''لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

اس لیے رسول اللہ ﷺ ان دس راتوں میں عبادت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور اعتکاف کرتے تھے۔ خود بھی رات کو جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) فرماتے ہیں:

''پس ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اس لیلہ مبارکہ میں رحمتوں کا طالب ہو اور اس رحمان و رحیم ہستی کے آگے سرِ نیاز خم کرے۔ جبین پُر معاصی کو زمین پر عجز و خاکساری سے رکھے اور بہ صد خضوع اور خشوع دستِ تضرع دراز کرے۔''

(ارکان اسلام، ص: ۲۲۹)

لیلۃ القدر اگر معلوم ہو جائے تو درج ذیل دعا اللہ تعالیٰ کے حضور کرنی چاہیے:

"اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ . " (جامع ترمذی)

''اے میرے اللہ! تُو بہت معاف فرمانے والا اور بڑا کرم فرما ہے اور معاف کر دینا تجھے پسند ہے پس تُو میری خطائیں معاف فرما۔''

نماز تراویح:

قیام رمضان یا نماز تراویح کا ادا کرنا فرض نہیں، بلکہ سنت ہے۔ اور اس سلسلے میں ائمہ کرام اور فقہائے عظام میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔

نماز تراویح کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا گیا کہ رمضان میں نماز تراویح رسول اللہ ﷺ کتنی رکعات ادا فرماتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"ماكان يزيد فی رمضان ولا فی غيره علی احد عشرة ركعة ."(صحيح بخاری)

''رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعت (آٹھ تراویح اور تین وتر) سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ نے جو تین دن (۲۳، ۲۵، ۲۷) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز تراویح پڑھائی تھیں وہ گیارہ رکعت (آٹھ تراویح اور تین وتر) تھیں۔ بیس رکعت تراویح پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

(احسن البیان، ص: ۴۷)

علمائے احناف میں سے امام ابن ہمام (فتح القدیر)، علامہ زیلعی (نصب الرایہ)، ملا علی قاری (مرقاۃ) مولانا رشید احمد گنگوہی (الحق الصریح) اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری (العرف الشذی) لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے رمضان میں گیارہ رکعت (آٹھ تراویح اور تین وتر) نماز ثابت ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں:

''از فعل آنحضرت (ﷺ) یازدہ ثابت شدہ است۔''

(مصفیٰ شرح موطأ امام مالک)

''آنحضرت ﷺ سے گیارہ رکعت (تراویح) ثابت ہے۔''

روزے میں اسلام کا اصلاحی کردار:

اسلام نے روزے کے بارے میں کیا اصلاحی کردار ادا کیا ہے؟ اس بارے میں نامور عالم دین مولانا سید ابوالحسن ندوی (م ۱۹۹۹ء) نے اپنی کتاب ''ارکان اربعہ'' میں بڑی مفید اور نفیس بحث فرمائی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''اسلام نے جس طرح دوسرے تمام فرائض و عبادات اور مناسک میں اپنا اصلاحی کردار ادا کیا ہے۔ اس طرح اس نے

روزے کے مفہوم، آداب واحکام اوراس کی شکل اورطریقہ کارمیں بھی اپناپہ اصلاحی وانقلابی کردارادا کیا ہے۔اوراس نے روزے کو بہت آسان وخوش گوار،فطرت سلیم کے بہت قریب، متعدد روحانی و اجتماعی فوائد کا حامل اور معاشرے میں پوری طرح اثر انداز بنا دیا ہے۔ شریعت اسلامی نے روزے کی ہیئت اورظاہری شکل پراکتفانہیں کیا۔بلکہ اس کی حقیقت اوراس کی روح کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے۔ روزے کی حالت میں اس نے صرف کھانے پینے اور جنسی تعلقات ہی کوحرام نہیں کیا بلکہ ہراُس چیز کوحرام اورممنوع قرار دیا ہے جو روزے کے مقاصد کے منافی اوراس کی حکمتوں اورروحانی واخلاقی فوائد کے لیےمضر ہے۔اس نے روزےکوادب وتقویٰ، دل اورزبان کی عفت وطہارت کے حصارمیں گھیر دیاہے۔رسول اللہ ﷺ کاارشاد ہے:

’’تم میں سے کوئی روزے سے ہوتو نہ بدکلامی اورفضول خرچی کرے اور نہ شور وشر کرے ۔ اگرکوئی اس کوگالی دے اورلڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوتو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔‘‘(صحیح بخاری)

حدیث قدسی میں ہے:

’’صرف روزہ ایسی چیز ہے جس کابدلہ میں دوں گا۔‘‘ (صحیح بخاری ومسلم)

شریعت اسلامیہ نے نہ روزے کونفس کوایذا پہنچانے اور تکلیف میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنایا ہےاور نہ اس کوخدا کا عذاب قرار دیا ہے۔اس نے اس کوایک ایسی عبادت کے طور پرپیش کیا ہےجس کا مقصداللہ تعالیٰ کاقرب حاصل کرنا ہے۔اس نے اس کےاحکام اورقوانین بھی ایسے خشک اور ظالمانہ نہیں بنائے کہ اس کاقطعی نتیجہ نفس کی ایذا رسانی کی شکل میں ظاہر ہوتا اوراس پراس کی طاقت کا زیادہ بوجھ پڑ جاتا۔ بلکہ اس نے سحری کھانا سنت قرار دیا، افطار میں عجلت کاحکم دیا، رات اور دن دونوں میں سونے اورآرام کرنے کی اجازت دی اور کاروبار،تجارت اورمفید کاموں میں انہماک ومصروفیت کوبھی روارکھا۔اسلام نے اس کوہرقسم کی بندش سے آزادکردیاہے۔اوراعلان کردیا کہ

۱: تم میں سے جوکوئی اس مہینے کوپائے لازم ہے کہ وہ (مہینا بھر)روزہ رکھے۔(البقرۃ:۱۸۵)

۲:تم میں سے جوشخص بیمار ہو یا سفرمیں اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا لازم ہے۔(البقرۃ:۱۸۴)‘‘

(ارکان اربعہ:۲۸۶-۳۰۱)



علوم قرآن

قرآن میں مذکور رنگ

سید عالم جمال شاہ، لاہور

علامہ رافعی فرماتے ہیں:

''قرآن کریم سارے کا سارا، زور کلام اور ندرت بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی بڑی وجہ قرآن کریم کی روح ترکیب ہے جو قرآن کے سوا عربی زبان میں کہیں نہیں پائی جاتی۔'' (تاریخ آداب العرب للرافعی: ۲/۲۶۰)

اسی طرح قرآن کے تشبیہ و استعارہ کنایہ و تعریض حقیقت و مجاز حصر و تخصیص ایجاز و اطناب خبر و انشاء جدل و مناظرہ اور امثال و اقسام سب مباحث ''الاتقان'' میں موجود ہیں اور اسی طرح قرآن کریم میں رنگوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ جس نے منظر کشی میں قرآن کریم کی سحر بیانی کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر حالات و واقعات کے اعتبار سے جس طرح رنگوں کا ذکر آیا ہے وہ بہ ذات خود ایک جداگانہ حسن صورت اور ایک منفرد رنگ رکھتا ہے۔ مختصراً ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں مذکور رنگ مندرجہ ذیل ہیں:

الابیض، بیضاء:

اس کے معنی ''سفید'' ہیں۔ الابیض مذکر اور بیضاء مونث کے لیے استعمال ہوتا ہے:

﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرة: ۱۸۷]

''کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تمھارے لیے سیاہ دھاگے سے سفید دھاگا فجر کا خوب ظاہر ہو جائے۔''

یہاں الخیط الابیض سے سپیدۂ فجر مراد لیا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ روشن اور چمک دار ہوتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بیضاء کا لفظ استعمال ہوا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿وَ نَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ۠﴾ [الاعراف: ۱۰۸]

یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر نکالا تو وہ سفید اور چمک دار تھا جس سے آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں۔

اسی طرح جنت کی شراب کے بارے میں آیا ہے:

﴿بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ۠﴾ [الصافات: ۴۶]

''(وہ شراب) سفید ہوگی، پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی۔''

حافظ صلاح الدین یوسف تحریر کرتے ہیں:

''دنیا میں شراب عام طور پر بدرنگ ہوتی ہے۔ جنت میں وہ جس طرح لذیذ ہوگی، خوش رنگ بھی ہوگی۔''

(تفسیر احسن البیان، ص: ۱۰۵۲)

جنت کی عورتوں کے بارے میں فرمایا:

﴿كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ﴾ [الصافات: ۴۹]

''ایسے جیسے چھپائے ہوئے انڈے۔''

کہا جاتا ہے کہ شتر مرغ کے انڈے خوش رنگ، زردی مائل سفید ہوتے ہیں اور ایسا رنگ حسن و جمال کی دنیا میں سب سے عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ تشبیہ صرف سفیدی میں نہیں بلکہ خوش رنگی اور حسن و رعنائی میں بھی ہے۔ امام راغب تحریر فرماتے ہیں:

''انڈا سفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے۔ اس لیے تشبیہ کے طور پر بیضہ بول کر خوب صورت عورت مراد لی جاتی ہے۔''

(مفردات، ص: ۱۳۷)

جنتیوں کے اطمینان وسکون کو بھی اسی مادے سے ذکر کیا گیا ہے:
﴿وَ اَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾
[آل عمران :۱۰۷]

''اور رہے وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے، سو اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔''

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں سے بہتر شمار کیا جاتا تھا۔ اس بنا پر آیت مذکورہ میں ابیضاض الوجوہ سے مراد مسرت ہے۔ (مفردات، ص:۱۴۷)

نیز یہاں سفیدی سے نور ایمان کی طرف بھی اشارہ ہے اور قیامت کے دن روشن چہرے وہی ہوں گے جو دین حق پر قائم اور ثابت رہے۔

نیز سورۂ فاطر میں فرمایا:
﴿وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ﴾[الفاطر: ۲۷]

''اور پہاڑوں میں سے کچھ سفید اور سرخ قطعے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور کچھ سخت کالے سیاہ ہیں۔''

یعنی جس طرح انسانوں میں مومن وکافر اور فاسق وصالح قسم کے لوگ ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات میں بھی تفاوت ہے اور اسی طرح پہاڑ اور اُس کے حصے یا راستے مختلف رنگوں کے ہیں۔ اُن میں سفید بھی ہیں، سرخ بھی ہیں اور انتہائی سیاہ بھی۔ یہ یکسانیت میں اختلاف اور اختلاف میں یکسانیت یہ مختلف رنگوں کا امتزاج ان میں توازن وتناسب، خوش نمائی اور دل فریبی، پھر ان کا انسان کے لیے کارآمد ہونا کیا یہ سب چیزیں کسی عظیم مدبر اور حکیم صناع کی طرف رہنمائی نہیں کرتیں! کیا یہ سب باتیں محض اتفاقات کا نتیجہ ہیں!

صفراء:

الصفرہ (زردی) ایک قسم کا رنگ جو سیاہی اور سفیدی کے مابین ہوتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا اور قوم نے غیر ضروری سوالات کے ذریعے گائے کو متعین کرنے کی کوشش کی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:
﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ [البقرة :٦٩]

یعنی وہ گائے گہرے زرد رنگ کی ہے۔

اسی طرح جہنم کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:
﴿اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝﴾
[المرسلات :۳۲،۳۳]

یعنی دوزخ کی چنگاریاں یوں ہیں گویا زرد رسیاں یا اونٹ۔

یہاں صفر ''اصفر'' کی جمع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی چنگاری اتنی بڑی ہوگی گویا کوئی محل یا قلعہ ہو۔ مزید برآں ہر چنگاری کے اتنے اتنے ٹکڑے ہوں گے گویا وہ اونٹ ہیں یا کشتیوں کی موٹی موٹی رسیاں۔

بعض کے نزدیک صفر ایک دھات کا نام ہے جس سے جہنم کی آگ کو زردی کی بنا پر تشبیہ دی گئی ہے۔ نیز فرمایا:
﴿ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾
[الحديد :۲۰]

''پھر وہ کھیتی پک جاتی ہے، پھر تُو اسے دیکھتا ہے کہ زرد ہے، پھر وہ چورا بن جاتی ہے۔''

یہاں دنیا کی زندگی کو سرعت زوال میں کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح کھیتی شاداب ہوتی ہے تو کاشت کاروں کو بھلی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن پھر وہ زرد ہو کر چورا چور ہو جاتی ہے۔ یہاں پر بھی زردی سے مراد زندگی کا چند روزہ ہونا ہے۔ اگرچہ دنیا کی زیب وزینت مال واولاد دل کو لبھانے والی ہیں۔ لیکن آخر میں حق بات یہی ہے کہ ان تمام اشیاء کو ثبات اور قرار میسر نہیں، یوں زردی سے بڑھاپے کو تشبیہ دے کر انسان کو عارضی اور ناپائیدار چیزوں کی بجائے دائمی اور مستقل اشیاء کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

الاخضر:

یہ ایک قسم کا رنگ ہے جو سفیدی سیاہ مائل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ [یس: ۸۰]

''وہ جس نے تمھارے لیے سبز درخت سے آگ پیدا کردی، پھر یکا یک تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔''

یعنی سرسبز درخت سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ آگ برآمد کرتا ہے اور سائنس کی دنیا میں اس سبز مادے کو Chlorophyll کہتے ہیں اور یہی وہ سبز مادہ ہے جو ضیائی تالیف کے ذریعے آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے توازن کو قائم رکھتا ہے تاکہ زمین میں تسلسل کے ساتھ حیات جاری رہ سکے۔

اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا﴾ [الانعام: ۹۹]

یعنی سرسبز کھیتوں سے تہ بہ تہ دانوں والے خوشے نکلتے ہیں اور کھجوروں کے گچھے پیدا ہوتے ہیں جو بوجھ کی وجہ سے جھکے ہوتے ہیں۔

نیز عزیز مصر کے خواب میں بھی اس رنگ کا ذکر موجود ہے جب اُس نے خواب کا ذکر اپنے دربار میں کیا:

﴿اِنِّیْٓ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْکُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ﴾ [یوسف: ۴۳]

''بے شک میں سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں جنھیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے اور کچھ دوسرے خشک (دیکھتا ہوں)۔''

اس منظر میں سات سوکھی بالیاں ہیں جو سات ہری بھری اور سرسبز بالیوں سے لپٹ گئی ہیں اور انھیں بھی سوکھا بنا دیا ہے۔ یہاں بھی تازے کو سبز سے ظاہر کیا گیا ہے۔

اسی طرح جنتیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِیٍّ حِسَانٍ﴾ [الرحمٰن: ۷۶]

''جنتی لوگ سبز اور نفیس و نادر قالینوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔''

نیز جنتیوں کے لباس میں اسی رنگ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ﴾ [الدھر: ۲۱]

''ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے اور گاڑھا ریشم ہوگا۔''

یعنی جنتیوں کو باریک ریشم کا جو لباس دیا جائے گا، وہ سبز رنگ کا ہوگا جو نگاہوں کو طراوت بخشے گا۔ اور حکماء کے نزدیک بھی سبز رنگ تازگی کی علامت ہے اور وہ آنکھوں کی بینائی کو برقرار رکھنے کے لیے سبزے کو دیکھنے اور اُس پر چلنے کا حکم دیتے ہیں۔

الاسود:

یہ بیاض کی ضد ہے اور سیاہ کو کہتے ہیں اور یہ رنگ اظہارِ غم سے کنایہ ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ [آل عمران: ۱۰۶]

''جس روز کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ۔''

تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہارِ مسرت اور سیاہ ہونے سے اظہارِ غم مراد ہے۔

اسی طرح بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر مشرکین کی حالت کو یوں بیان کیا:

﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ کَظِیْمٌ﴾ [النحل: ۵۸]

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ دن بھر کالا رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے۔''

یہاں بھی چہرے کی سیاہی سے غم ہی مراد ہے۔

نیز قیامت کے دن اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے اسی رنگ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَی الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلَی اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ﴾ [الزمر: ۶۰]

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

الشیخ حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات   تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

حافظ صلاح الدین یوسف

یزید کے بارے میں شیخ کا موقف اور بعض حضرات کا رویہ:

ایک اور مسئلہ جو بعض حضرات کے متحدیانہ رویے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس سلسلے میں بھی چند گزارشات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور اس موقعے پر بالخصوص اس کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق بھی شیخ زبیر علی زئی کے موقف ہی سے ہے اور وہ مسئلہ ہے یزید کی مغفرت اور عدم مغفرت کا۔

اس میں دو پہلو قابل غور ہیں: یزید تقویٰ و طہارت اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے کیسا تھا؟

اس میں لوگ مختلف الرائے ہیں، جو حضرات اس کی طرف فسق و فجور کی نسبت کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ پروپیگنڈے کی وجہ سے اس کو شہرت تو ضرور مل گئی ہے لیکن کسی مستند روایت سے اس کا ثبوت پیش کرنا نہایت مشکل ہے۔

جو حضرات فسق و فجور کی اس کی طرف نسبت کو صحیح نہیں سمجھتے، وہ اس کے اخلاق و کردار کے بارے میں زیادہ بحث کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایک تو کسی مستند روایت سے اس کو بدکردار ثابت کرنا مشکل ہے۔ ثانیاً: ہمیں فوت شدگان کی بابت حکم ہے:

((اذکروا محاسن موتاکم.))

''اپنے فوت شدگان کی خوبیاں بیان کرو۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے میں اگر اچھائیاں اور برائیاں دونوں ہی ہیں تو تم اس کی صرف اچھائیوں کا ذکر کرو۔ کیوں کہ برائیوں کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، ہوسکتا ہے اس نے اپنی زندگی میں ان سے توبہ کر لی ہو، جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔ اللہ نے اس کی توبہ قبول کر کے یا دیگر اعمالِ خیر کی وجہ سے اس کو معاف کر دیا ہو۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی بابت فرمایا ہے:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التوبة: ۱۰۲]

ثالثاً: اس کا تعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت و کردار سے ہے جس کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی کسی ایک آیت ہی میں نہیں، متعدد مقامات پر دی ہے۔ اگر یزید کو فاسق و فاجر مان لیا جائے تو متعدد جلیل القدر صحابہ (حضرت معاویہ، مغیرہ بن شعبہ وغیرہما رضی اللہ عنہم) کی عظمت پر حرف آتا ہے کہ اُنھوں نے ایسے شخص کو خلافت کے لیے نامزد کیا۔

مزید برآں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کے وقت بھی جس کے نتیجے میں ان کی مظلومانہ شہادت کا المناک سانحہ رونما ہوا، متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زندہ تھے، لیکن کسی ایک صحابی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ بعض نے تو ان کو اس اقدام سے روکا اور اس کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ ان صحابہ کی بابت بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنھوں نے حضرت حسین علیہ السلام کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ کیا وہ حق کے معاملے میں مداہنت کے قائل تھے؟ کیا حق کے لیے لڑنا صحابہ رضی اللہ عنہم کا شیوہ نہیں تھا؟ اگر ایسا تھا تو کیا ان کا یہ کردار قرآن کے بیان کردہ کردار کے مطابق تھا؟ نہیں، نہیں، صحابہ رضی اللہ عنہم ہرگز مداہن نہیں تھے، حق کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے والے تھے۔ اُنھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ اس لیے نہیں دیا کہ وہ یزید کو ایسا نہیں سمجھتے تھے جیسا آج کل باور کرایا جا رہا ہے۔

رابعاً: یزید کا معاملہ مشاجرات صحابہ ہی سے تعلق رکھتا ہے جس کی بابت اہل سنت کا موقف سکوت کا ہے نہ کہ بحث وتمحیص کا۔

بنابریں ہمیں یزید سے زیادہ دلچسپی نہیں، ہماری یزید کے ساتھ جتنی کچھ بھی دلچسپی ہے، وہ صرف صحابہ کی وجہ سے ہے کہ اس کی آڑ میں صحابہ رضی اللہ عنہم پر طعن زنی کا راستہ کھلتا ہے۔

شیعی آئیڈیالوجی بھی یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے صحابہ کی شخصیت کو داغ دار کریں، ان کی عظمت کو مجروح کریں، ان کو بزدل، منافق اور بے ایمان ثابت کریں (نعوذ باللہ من ذلک) کیا ہمارے وہ حضرات جو بلاوجہ اس محاذ پر سرگرم ہیں، وہ دشمنانِ صحابہ کو تقویت نہیں پہنچا رہے! اور کیا وہ شیعی آئیڈیالوجی ہی کو غیر شعوری طور پر فروغ نہیں دے رہے!

حافظ زبیر علی زئی کے موقف سے سب وشتم کا دروازہ کھولنا غیر دانش مندانہ رویہ ہے:

اس سلسلے میں سب سے اہم وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم.))

(صحيح بخاري، رقم: ٢٩٢٤)

''میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر (روم) کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا، وہ بخشا بخشایا ہے۔''

قسطنطنیہ عیسائیوں کی رومی سلطنت کا ایک شہر تھا، اس کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں نے کئی مرتبہ لشکر کشی کی، اس حدیث میں پہلے پہل حملہ آور لشکر کے شرکاء کے لیے مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس حدیث کے شارحین اور اکثر اہل تاریخ نے اس پہلے لشکر میں یزید کی شمولیت کی وضاحت کی ہے جس کی وجہ سے اکثر اہل علم یزید کی بھی مغفرت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ تاہم بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور یزید کی شمولیت والے لشکر کو وہ پہلا لشکر تسلیم نہیں کرتے۔ اس بنا پر یزید کی مغفرت کو وہ یقینی نہیں سمجھتے۔

ہمارے شیخ ممدوح حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ بھی اسی دوسرے موقف کے قائل تھے۔ ان کی تحقیق میں پہلے لشکر میں یزید شامل نہیں تھا۔ (مقالات علی زئی: ۱/۳۱۱)

گویا یہ دو موقف ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل ہیں۔ پہلے موقف کی رُو سے یزید کی مغفرت یقینی ہے اور دوسرے موقف کی رُو سے ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا معاملہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔

یہ دوسرا موقف بھی، جو ہمارے شیخ ممدوح کا ہے، یزید پر سب وشتم کا جواز مہیا نہیں کرتا۔ گناہ گار سے گناہ گار مسلمان کی بابت بھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ نے اس کو معاف نہیں کرنا۔ علاوہ ازیں اس کے لیے مغفرت کی دعا بھی جائز ہوگی۔ اور جب اس کی مغفرت کا امکان ہے تو مرنے کے بعد اس کے مثالب ومعائب بیان کرکے اس پر سب وشتم کا جواز اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دفاع کرنے والوں پر ناوک افگنی کا جواز کس طرح ہو جائے گا؟ جو ہمارے شیخ ممدوح رحمہ اللہ کے بعض نادان دوستوں نے اپنا وتیرہ بنایا ہوا ہے!

اس لیے شیخ رحمہ اللہ کے حلقہ ارادت اور ان کے خوان علم کے ریزہ چینوں سے ہماری یہی گزارش ہے کہ بے شک وہ شیخ والا موقف رکھیں لیکن اس کو اسٹیجوں اور مناظروں کا موضوع نہ بنائیں، نہ صحابہ کا دفاع کرنے والوں پر ناصبیت کا فتویٰ داغیں اور نہ اس کو حُبّ اہل بیت سے جوڑیں۔ اس لیے کہ یہ سارے عنوانات خوش نما ضرور ہیں لیکن یہ شیعیت کے وہی ہتھکنڈے ہیں جن کے ذریعے سے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو مطعون کرکے اپنے دلوں کی بھڑاس بھی نکالتے ہیں اور عوام کو بھی صحابہ کی بابت گمراہ کرتے ہیں۔

راقم یہ گزارشات شیخ رحمہ اللہ کی زندگی میں عرض کرنا چاہتا تھا کیوں کہ مختلف اطراف سے، حتیٰ کہ مقبوضہ کشمیر (بھارت) تک سے بھی لوگ اس طرح کی وضاحت راقم سے طلب کرتے تھے۔ لیکن

مصروفیات کے ہجوم نے اس کا موقع نہیں دیا حتیٰ کہ حضرت الشیخ رحمہ اللہ رحمت الٰہی کے جوار میں چلے گئے اور راقم کی یہ آرزو صفحۂ قرطاس پر منتقل نہ ہو سکی، دل ہی دل میں رہ گئی۔ بہ ہر حال اب جو کچھ عرض کیا گیا ہے الدین النصیحة کے تحت خیر خواہی کے جذبے ہی سے کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ و مقصد نہاں خانۂ دل میں بحمد اللہ نہیں ہے۔ واللہ علی ما اقول شہید۔ (۸ فروری ۲۰۱۴ء)

شیعیت نوازی اور بے اعتدالی کی ایک عجیب وغریب مثال:

مذکورہ سطور حوالۂ قرطاس کرنے کے بعد ایسے افراد کی طرف سے، جن کی طرف مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے، بے اعتدالی کا ایک عجیب وغریب نمونہ سامنے آیا ہے جس کا اظہار ایک رسالے میں کیا گیا ہے۔

ماہ نامہ ''ضرب حق'' (سرگودھا) میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی شان و منقبت میں ایک صاحب (ابو عبد اللہ نقوی) نے مضمون لکھا ہے۔ اس کی تیسری قسط (مارچ ۲۰۱۴ء) میں موصوف لکھتے ہیں:

''اور یہ کہتے ہو کہ حسین رضی اللہ عنہ کو علیہ السلام نہیں کہنا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ تم کو سلام کرنا چاہیے کیوں کہ تمھارے کام بہت اچھے ہیں۔ علیہ السلام کا معنی ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ پر سلامتی ہو۔ حسین رضی اللہ عنہ کے لیے اگر علیہ السلام جائز نہیں تو پھر اللھم صلی علی محمد و علیٰ آل محمد سے نکال دو۔ میرے حسین رضی اللہ عنہ کو علیہ السلام کہنا جائز نہیں تو پھر السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین کا معنی کیا؟ اگر سلام جائز نہیں، پھر جو مومن سلام کہتے ہیں، یہ کیوں؟ یہ مانو کہ جس طرح السلام علیکم عام مومن کو جائز ہے، اسی طرح میرے حسین رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور بار بار رحمتوں کی دعا کرو......کوئی کہتا ہے کہ جس نے حسین کو علیہ السلام کہا، اس سے کفر لازم آتا ہے، قرآن حسین رضی اللہ عنہ کو علیہ السلام کہتا ہے، حدیث حسین کو علیہ السلام کہتی ہے......الخ۔'' (صفحہ:۱۲)

مضمون نگار کا انداز بیان ایسا ہے جیسے شیعہ ذاکر اہل سنت کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور انھیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شان اور فضیلت کا منکر باور کرا رہا ہے۔ لیکن ہم مضمون نگار سے پوچھتے ہیں کہ اہل سنت، بالخصوص اہل حدیث میں کون ایسا ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے فضائل پر مبنی صحیح احادیث کا منکر ہے؟ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلقہ فضائل کی احادیث بیان کرتے ہوئے مذکورہ انداز گفتگو کا جواز کیا ہے؟ کیا شیعہ حضرات کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ہم تو فضائل حسین رضی اللہ عنہ کے قائل ہیں لیکن ہم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی فضیلت نہیں مانتے۔ کیا یہ تاثر صحیح ہے؟ اور گفتگو کا یہ انداز صحیح ہے؟

''امام'' اور ''علیہ السلام'' کی حقیقت:

بات تو ایک علمی مسئلے کی وضاحت کی ہے جس کا تعلق اہل سنت کی چند علمی اصطلاحات سے ہے اور اس کا مقصد بھی اہل سنت کو شیعیت کے ان مخفی گوشوں سے آگاہ کرنا ہے جن کے پردے میں شیعی آئیڈیالوجی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ راقم نے آج سے کئی سال قبل لکھا تھا:

''اہل سنت کی اکثریت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا سوچے سمجھے ''امام حسین علیہ السلام'' بولتی ہے حالانکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''امام'' کا لفظ بولنا اور اسی طرح ''رضی اللہ عنہ'' کے بجائے ''علیہ السلام'' کہنا بھی شیعیت ہے۔ ہم تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عزت و احترام کے لیے حضرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں (حضرت کے بجائے سیدنا کا لفظ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کئی لوگ کرتے بھی ہیں) حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ ہم کبھی امام ابو بکر صدیق، امام عمر، امام عثمان نہیں بولتے۔ اسی طرح ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے بعد ''رضی اللہ عنہ'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور کبھی ابو بکر صدیق علیہ السلام یا حضرت عمر علیہ السلام نہیں بولتے۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' کے بجائے ''علیہ

السلام''بولتے ہیں۔کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ دراصل یہ شیعیت کا وہ اثر ہے جو غیر شعوری طور پر ہمارے اندر داخل ہو گیا ہے۔اس لیے یاد رکھیے کہ چونکہ شیعوں کا ایک بنیادی مسئلہ ''امامت'' کا بھی ہے اور امام ان کے نزدیک انبیاء کی طرح من جانب اللہ نامزد اور معصوم ہوتا ہے۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کے بارہ اماموں میں سے ایک امام ہیں،اس لیے ان کے لیے ''امام'' کا لفظ بولتے ہیں اور اسی طرح ان کے لیے ''علیہ السلام'' لکھتے اور بولتے ہیں۔ہمارے نزدیک وہ ایک صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں،''امام معصوم''نہیں۔نہ ہم شیعوں کی امامت معصومہ کے قائل ہی ہیں۔اس لیے ہمیں انھیں دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ'' لکھنا اور بولنا چاہیے،''امام حسین علیہ السلام''نہیں۔کیوں کہ یہ شیعوں کے معلوم عقائد اور مخصوص تکنیک کے غماز ہیں۔''(سانحہ کربلا،رسومات محرم،ص:۳۰)

بتلائیے!اس عبارت میں،سوائے شیعی عقیدے اور طرز فکر کی نشان دہی کے،کیا ہے؟کیا اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین وتنقیص کا کوئی پہلو ہے؟کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کسی فضیلت کا انکار ہے؟یا اس میں کہیں کہا گیا ہے کہ حسین کو علیہ السلام لکھنے سے کفر لازم آتا ہے؟

علاوہ ازیں ہماری تحریر میں کون سی ایسی بات ہے جس کو غیر معقول یا اہل سنت کے موقف کے خلاف قرار دیا جا سکتا ہے؟

بات اصطلاحات کی ہے نہ کہ لغوی معنوں کی:

اب رہا مسئلہ ''علیہ السلام'' کے لغوی معنی کا۔اس کے لغوی معنی یقیناً یہی ہیں جو ہم ایک دوسرے کو ''السلام علیکم'' کہتے ہیں۔اس لغوی معنی کے اعتبار سے ہر زندہ یا فوت شدہ شخص کو سلام (علیہ السلام) کہنا جائز ہوگا۔لیکن بحث لغوی معنی کی نہیں ہے،اصطلاح کی ہے۔جب کوئی لفظ ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو پھر اس کے لغوی معنی کو نہیں دیکھا جاتا،اسے بہ طور اصطلاح اسی مفہوم میں لیا جاتا ہے جس کے لیے وہ رائج ہوتا ہے۔جیسے "رحمه الله" یا "رحمة الله عليه" ہے۔یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے جیسے علیہ السلام دعائیہ کلمہ ہے۔اس کے لغوی معنی ہیں ''اللہ اس پر رحم کرے'' یا ''اس پر اللہ کی رحمت ہو۔''اس لغوی معنی کے لحاظ سے یہ دعائیہ کلمہ ہر زندہ یا مردہ شخص کے لیے بول سکتے ہیں کیوں کہ زندہ اور مردہ دونوں ہی اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔لیکن یہ دونوں دعائیہ کلمے زندہ شخص کے لیے استعمال نہیں کیے جاتے۔کیوں؟کیا وہ رحمت الٰہی کا ضرورت مند نہیں ہے؟یا معنی کے لحاظ سے اس پر بولنا صحیح نہیں ہے؟دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں۔لغوی معنی کے لحاظ سے ہر شخص کے لیے اس کا استعمال کرنا صحیح ہے۔لیکن یہ فوت شدہ کے لیے ہی بہ طور اصطلاح استعمال ہوتے ہیں۔آپ کسی زندہ شخص کا نام لے کر اس کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہیں گے تو وہ نہایت تعجب سے آپ کا منہ دیکھے گا اور پوچھے گا:کیا وہ فوت ہو گیا ہے؟اگر آپ وضاحت کریں گے کہ نہیں وہ زندہ ہے تو آپ کے رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیا جائے گا اور اس موقع پر اس کے استعمال کو ناپسندیدہ قرار دیا جائے گا،چاہے آپ کتنے بھی خلوص سے یہ دعائیہ کلمات استعمال کریں۔

ایک دوسری مثال سے سمجھیے!لفظ صلاۃ،جس کے متعدد لغوی معنوں میں سے ایک معنی دعا بھی ہے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾[التوبة:۱۰۳]

''اے پیغمبر!ان سے ان کے مالوں کی زکات وصول کر کے اس کے ذریعے سے ان کی تطہیر اور ان کا تزکیہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں،بے شک آپ کی دعا ان کے لیے سکون وطمانیت کا باعث ہے۔''

اور حدیث میں آتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی صدقہ

وزکات کی رقم لاتا تو آپ ﷺ اس کے لیے دعا فرماتے، حضرت ابواوفیٰ رضی اللہ عنہ صدقے کی رقم لے کرآئے تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی:

((اللهم صل على آل ابى اوفى.))

(صحيح بخارى، رقم: ٦٣٣٢)

''اے اللہ! ابواوفیٰ کی آل پر رحمت فرما۔''

صلاۃ یہاں دعائے رحمت کے معنی میں ہے، اس لیے کہ علماء نے صراحت کی ہے کہ جب لفظ صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو اس کے معنی رحمت کے اور فرشتوں کی طرف ہو تو معنی استغفار کے اور نبی اور مومنین کی طرف ہو تو اس کے معنی دعا کے ہوتے ہیں۔ علامہ زحیلی لکھتے ہیں:

''والصلاة من الله على عباده: الرحمة، ومن ملائكته: الاستغفار، ومن النبى والمؤمنين: الدعاء.''

(التفسير المنير، پاره:١١، ص:٢٩)

اس اعتبار سے جب ہم درود ''اللهم صلى على محمد وعلى آل محمد...... إلخ.'' پڑھتے ہیں تو اس کے معنی دعائے رحمت ہی کے ہیں، کیوں کہ یہاں صلاۃ کی نسبت اللہ ہی کی طرف ہے: ''اے اللہ محمد اور آل محمد پر صلاۃ بھیج''، صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ''محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر رحمت نازل فرما۔''

صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی بھی یہی ہوں گے ''آپ پر رحمت اور سلامتی نازل فرما۔'' اب آپ اس کے لغوی معنی کی طرف دیکھیں گے تو ہر عام وخاص اور ہر زندہ وفوت شدہ کے لیے اس کا استعمال جائز ہونا چاہیے، کیوں کہ ہر شخص ہی اللہ کی رحمت کا بھی محتاج ہے اور امن وسلامتی کا خواہاں بھی۔ اس لیے کسی بھی شخص کا نام لے کر اگر آپ کہیں گے صلی اللہ علیہ وسلم ''فلاں پر رحمت اور سلامتی نازل ہو'' تو کیا لغوی اعتبار سے غلط ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ اگر لغوی معنی ہی کو ہر جگہ جواز کی بنیاد بنایا جائے گا تو جس طرح محمد ﷺ کہنا صحیح ہے، اسی طرح حسن ﷺ، حسین ﷺ، علی ﷺ، ابوعبداللہ نقوی (مضمون نگار) ﷺ کہنا بھی جائز ہوگا!!!

کیا مضمون نگار کے طرز استدلال کی بنیاد پر اس کو ناجائز یا غیر صحیح قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ مضمون نگار کی منطق کی رُو سے ہر ایک کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہوگا۔

اہل سنت کا معتدل موقف:

لیکن جو موقف ہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بابت ان کو ''علیہ السلام'' کہنے اور لکھنے کے بارے میں اختیار کیا ہے، وہ اعتدال پر مبنی اہل سنت کا موقف ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ چند دعائیہ کلمات ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتے ہیں جن سے مقصود مخصوص تشخص کو قائم کرنا، رکھنا یا ان کی عظمت وتقدس کا تحفظ کرنا ہے، ان کو ہر ایک کے لیے استعمال کرنا مسلک اہل سنت سے انحراف ہے۔ یہ اصطلاحات حسب ذیل ہیں:

۱: رضى الله عنه: یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے مخصوص ہے۔
۲: صلى الله عليه وسلم یا عليه الصلاة والسلام: نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔ تاہم بعض دفعہ دیگر انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی اسے استعمال کرلیا جاتا ہے۔
۳: اسی طرح تبعاً صلى الله على النبى محمد و آله وصحبه و ذريته اجمعين کا استعمال بھی سلف سے ثابت ہے۔
۴: علیہ السلام کا استعمال دیگر انبیاء علیہم السلام کے لیے ہے۔
۵: رحمه الله یا رحمة الله عليه: فوت شدگان کے لیے ہے۔
۶: ''امام'' کا لفظ علوم قرآن وحدیث کے ماہرین کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے ائمہ اربعہ، امام ابن تیمیہ، امام ابن القیم، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی وغیرہم رحمہم اللہ ہیں۔
۷: امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین اسلامی حکمران کے لیے ہے۔

شیعوں کا عقیدہ امامت:

اس کے برعکس شیعوں کا عقیدہ امامت ہے۔ان کے نزدیک امام مامور من اللہ ہوتا ہے،یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نبوت کے لیے کسی کو چن لیتا ہے(جس کا سلسلہ اب ختم ہوگیا ہے)اسی طرح وہ امام کو چنتا اور امامت پر فائز کرتا ہے جیسے نبی کو نبوت پر فائز کرتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک نبوت کی طرح امامت بھی کسبی نہیں، وہبی ہے۔یعنی جس طرح کسب ومحنت سے نبوت حاصل نہیں ہوسکتی یا لوگوں کے منتخب کرنے سے کوئی نبی نہیں بن سکتا،اسی طرح امامت بھی نہ کسب ومحنت سے حاصل ہوسکتی ہے اور نہ لوگوں کے منتخب کر لینے سے۔

دوسرا عقیدہ ان کا یہ ہے کہ امام بھی نبی کی طرح معصوم ہوتا ہے۔

تیسرا عقیدہ ہے کہ ان کو حلال وحرام کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے۔

چوتھا عقیدہ ہے کہ وہ عالم ما کان وما یکون ہوتا ہے۔ پانچواں عقیدہ ہے کہ وہ کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔انھی وجوہ سے تقریباً سارے شیعہ فرقے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل ہیں۔(اعاذنا اللہ منہ)

ایسے امام ان کے نزدیک اللہ نے بارہ مقرر فرمائے جن میں سے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں،دوسرے حضرت حسن اور تیسرے حضرت حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔بارہویں امام جو چھ سال کی عمر میں غائب ہو گئے تھے،امام غائب یا امام مہدی منتظر کہلاتے ہیں،یعنی ان کا انتظار کیا جا رہا ہے،کیوں کہ وہی آ کر دنیا میں عدل وانصاف قائم کریں گے اور ظالموں (غاصبوں) کو سزائیں دیں گے،جن میں حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں،اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت غصب کر کے خلافت کا منصب سنبھال لیا تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا،نہ کہ ان کا۔اس لیے یہ تینوں خلفاء راشدین نہیں بلکہ ظالم وغاصب ہیں۔(نعوذ باللہ من هذه الاكاذيب والافتراءات)

یہ ہے حضرات شیعہ کا عقیدہ امامت،جس کے تحت وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی امام حسین کہتے،بولتے اور باور کراتے ہیں۔ہم اہل سنت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ایک صحابی سمجھتے ہیں۔اس لیے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ان کے لیے بھی رضی اللہ عنہ لکھتے،بولتے اور لوگوں کو تلقین کرتے ہیں۔کیوں؟ اس لیے کہ جب ہمارے نزدیک شیعوں کا عقیدہ امامت غلط اور قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت بارہ اماموں کا تصور بھی ایک مفروضہ ہے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے ''امام'' کا لفظ کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ اور جب وہ ہمارے نزدیک انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم بھی نہیں ہیں تو ان کے لیے علیہ السلام کی اصطلاح کا استعمال بھی اہل سنت کے مسلک حق سے انحراف ہے۔

مضمون نگار کی ایک اور دلیل:

ایک دلیل ''ضرب حق'' کے مضمون نگار نے یہ دی ہے کہ صحیح بخاری کے باب مناقب فاطمہ میں حضرت فاطمہ کے ساتھ علیہا السلام لکھا ہوا ہے،اس لیے علیہ السلام کا استعمال جائز ہے۔

لیکن اس دلیل میں نہ کوئی وزن ہے اور نہ کوئی معقولیت۔اس لیے کہ یہ نسخے صدیوں تک قلمی رہے ہیں۔بنابریں ان نسخوں میں لفظی اختلافات موجود ہیں جن سے اہل علم باخبر ہیں۔مطبوعہ شکل میں،جیسے آج کل ہیں،کئی صدیوں کے بعد معرض وجود میں آئے ہیں اس لیے قلمی نسخوں میں یہ لفظی اختلافات ناسخوں (ناقلوں) کی وجہ سے ہیں،ان کو امام بخاری کی طرف قطعی طور پر منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے پاک وہند کے مدارس دینیہ میں صحیح بخاری کا جو متداول نسخہ (دو جلدوں میں) پڑھا پڑھایا جاتا ہے،اس میں صرف باب مناقب فاطمہ ہے،اس کے آگے نہ رضی اللہ عنہا ہے اور نہ علیہا السلام۔عربی نسخوں میں البتہ دونوں ترکیبیں ہیں۔بعض میں رضی اللہ عنہا ہے اور بعض میں علیہا السلام۔تاہم جن میں سلام ہے،ان کی شرح میں رضی اللہ عنہا ہی ہے،دیکھیے فتح الباری اور شرح الکرمانی۔

اس کی مزید تحقیق صحیح بخاری کے چند قلمی نسخے اگر دستیاب ہو

جائیں تو ان کی روشنی میں ممکن ہے۔ صحیح بخاری کا ایک قلمی نسخہ قومی عجائب گھر کراچی کے شعبہ مخطوطات میں موجود ہے (فکر ونظر، اسلام آباد، مخطوطات نمبر، شمارہ اکتوبر- دسمبر ۱۹۹۷ء، جنوری -مارچ ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۳۸) اسے دیکھنا چاہیے۔ کہیں اور بھی کچھ نسخے ہوں تو سبحان اللہ!

تاہم اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ الفاظ امام بخاری رحمہ اللہ ہی کے تحریر کردہ ہیں تب بھی یہ دلیل نہیں بن سکتے، یہ رواج عام یا غایت درجہ عقیدت یا غیر شعوری سبقت کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے: لا عصمۃ الا للہ۔ امام بخاری کو بھی مقام عصمت حاصل نہیں ہے اور باب کا عنوان تجویز کرنا، یہ ایک اجتہادی امر ہے جس میں غلطی کا امکان ہے، اگر اس باب میں علیہا السلام کے الفاظ امام صاحب ہی کے تحریر کردہ ہیں تو یہ کوئی نصِ شریعت نہیں بن گئے ہیں جن سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

باقی رہا مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ قرآن حسین رضی اللہ عنہ کو علیہ السلام کہتا ہے، حدیث حسین کو علیہ السلام کہتی ہے۔ یہ غلو اور اِفراط کا وہ مظاہرہ ہے جس کو دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ خود مضمون نگار نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ہر جگہ حسین رضی اللہ عنہ ہی لکھا ہے، مضمون کی اس تیسری قسط میں تقریباً ساٹھ جگہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ لکھا گیا ہے، ایک جگہ بھی حسین علیہ السلام نہیں لکھا۔ دوسری قسط میں حضرت حسین کو باون جگہ رضی اللہ عنہ لکھا ہے، کسی ایک جگہ بھی ''علیہ السلام'' نہیں ہے۔ پہلی قسط ہمیں دستیاب نہیں ہو سکی۔ بہر حال دوسری اور تیسری قسط میں تقریباً ایک صد بارہ جگہ نام آیا لیکن ایک جگہ بھی ''علیہ السلام'' نہیں ہے۔ سچ ہے: ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے''

(۱۲ مارچ ۲۰۱۴ء)



انتقال پر ملال

مولانا حکیم فیض عالم صدیقی شہید رحمہ اللہ کے بڑے بیٹے ڈاکٹر سعید فیض گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔
ڈاکٹر فیض الرحمان شاہ صدیقی، خادم قباء مسجد بھلوال، ضلع سرگودھا



ضرورت ہے

مرکز اسلامی تحقیق وتالیف، دار المعارف ریلوے روڈ لاہور میں ایک ماہر کمپوزر کی ضرورت ہے۔
رابطہ: 0320-4040536

دعائے مغفرت

میری بیٹی ۲ رجون ۲۰۱۴ء کو وفات پا گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
جماعتی احباب سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔
حکیم محی الدین بھٹی، حسین خانوالہ چک نمبر ۸ پتوکی، ضلع قصور



تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے

دلکشا تذکرہ میاں محمد عالم

مرتب: محبوب عالم تھابل
ناشر: کتب خانہ محمد عالم مختار حق، شہاب ٹاؤن، بند روڈ، لاہور
ضخامت: ۱۶۰ صفحات، بہترین کاغذ، عمدہ کمپوزنگ، اچھی طباعت
تبصرہ نگار: محمد اسحاق بھٹی

بہت عرصہ پیشتر پہلی دفعہ محمد عالم مختار حق کا نام حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرحوم کی زبان مبارک سے سنا۔ اس سے کچھ مدت بعد ان سے تعارف ہوا۔ تعارف نے میل جول کی شکل اختیار کی اور میل جول دوستی کے قالب میں ڈھلا۔ وہ ملک کی بزم عمل اور محفل کتاب کے بہت بڑے رکن تھے۔ مطالعہ وسیع اور ارباب علم وادب سے قرب وتعلق کا دائرہ دور تک پھیلا ہوا۔ ان کا کتب خانہ مختلف موضوعات کی چودہ ہزار سے زائد کتابوں پر محیط اور بہت سے زاویہ ہائے فکر کی تصانیف کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے۔

اس مرد خوش خصال کو کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا اور کتابیں بھی ان سے اس قدر دلچسپی رکھتی تھیں کہ ان کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔

برصغیر کے لاتعداد علماء ومحققین اور ادباء وشعراء نے کتابیں لکھیں اور اہل ذوق کے مطالعہ میں آئیں۔ محمد عالم مختار حق عمر بھر ان کتابوں کو اپنے کتب خانے کی زینت بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ اپنے ذوق کی جو کتاب جہاں سے ملی اور جس قیمت پر ملی اسے حاصل کرنے کی سعی کی۔ ان کا ذخیرہ کتب زیادہ تر اردو زبان پر مشتمل ہے، جس میں اسلامیات، تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت، مناظرات، مکتوبات، ادبیات، شعر، لغات، شخصیات، بے شمار رسائل وجرائد کے خاص نمبر اور سفرنامے اور خاکے خاص ترتیب کے ساتھ موجود ہیں۔ فارسی شعر وادب کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن مجید کے بہت سے تراجم (اُردو، فارسی، پنجابی) ان کے کتب خانے کی زینت ہیں۔ بغیر ترجمے کے بھی مختلف مقامات کے مطبوعہ قرآن مجید دعوتِ زیارت دیتے ہیں۔ انگریزی، سندھی اور پنجابی نظم ونثر کی کتابوں سے بھی یہ کتب خانہ آشنا ہے۔

کتنے ہی مشہور اصحابِ علم نے ان کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ خود میری رفاقت میں بعض اہل تحقیق ان کے پاس گئے اور ان کے کتب خانے سے مستفید ہوئے۔ وہ اہل علم سے علمی تعاون کر کے خوش ہوتے تھے۔ ان کے تعاون سے متعدد لوگوں نے پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے۔

شوقِ جمع کتب کے ساتھ ساتھ تحریر ونگارش سے بھی ان کے گہرے مراسم قائم تھے۔ ان کا قلم خاص رفتار کے ساتھ سفر تحریر طے کرتا رہتا تھا اور معلومات کی غذا اُسے حسب ضرورت برابر ملتی رہتی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مرتبات ومصنفات کی تعداد تیس کے عدد سے ملی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے کتنے ہی علمی جرائد میں خالص تحقیقی مقالات سپرد قلم کیے۔

''نقوش جمیل'' کے نام سے اُنھوں نے اپنے والد مکرم میاں حاجی محمد حسین مرحوم کے حالات شائع کیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرِ روزگار شخصیت: یہ مولانا غلام رسول مہر کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق لکھے اور جناب محمد عالم مختار حق نے انھیں ترتیب دیا اور اس

پرخوب صورت مقدمہ تحریر کیا۔

غالبیات مہر: یعنی مرزا غالب پر مولانا غلام رسول مہر کے مقالات کا مجموعہ۔

گنجینۂ مہر: یہ مولانا غلام رسول مہر کے وہ خطوط ہیں جو اُنھوں نے محمد عالم مختار حق صاحب کے نام لکھے۔ دو جلدوں پر مشتمل یہ سیکڑوں علمی اور ادبی و تحقیقی نوعیت کے بے مثال خطوط ہیں۔

مشفق نامے: یہ پاکستان کے مشہور ادیب و محقق جناب مشفق خواجہ مرحوم کے خطوط ہیں جو عالم صاحب کے نامے لکھے گئے۔

علاوہ ازیں نگارشاتِ ڈاکٹر حمید اللہ، مکتوبات ڈاکٹر مختار الدین احمد بہ نام پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، مجالس جمیل، فیض جمیل۔ اردو میں اربعینیات، فہرست تراجم قرآن مجید اردو اور پنجابی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف کی مجمل کتابیات وغیرہ ان کی تصانیف ومرتبات میں شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی پر اُنھوں نے محققانہ مضمون لکھا۔ مارچ ۲۰۰۵ء میں ہفت روزہ الاعتصام کا ''مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی'' کے عنوان سے ۱۲۳۰ صفحات پر محیط خاص نمبر شائع ہوا، جس میں بہت سے اہل قلم نے مولانا کی مختلف علمی حیثیتوں کی وضاحت کی۔ اس نمبر میں محمد عالم مختار حق مرحوم کا مقالہ بھی ''ایک کتاب دوست: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف'' کے عنوان سے معرضِ اشاعت میں آیا۔

وہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ پروف ریڈنگ ایک مستقل اور اہم فن ہے۔ اس میں وہ بڑی مہارت رکھتے تھے اور بعض مشہور مصنف و ناشر اس باب میں ان کے محتاج تھے۔ بغیر کسی مسلکی امتیاز کے اصحاب علم سے ملنا اور ان سے مستفید ہونے کی کوشش کرنا ان کا وہ وصف تھا جو اس دورِ خود پسندی میں بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے۔ میں بھی ان کی خدمت میں جاتا اور وہ بھی میرے غریب خانے پر تشریف لایا کرتے تھے۔ ان سے مل کر اور ان سے باتیں کر کے بڑی مسرت ہوتی تھی۔ ان کے فرزند گرامی محبوب عالم صاحب بھی عام طور پر ان کی رفاقت میں آیا کرتے تھے۔

کچھ مدت سے ان میں کچھ کمزوری کے آثار ابھر آئے تھے۔ ۲۶ یا ۲۷ فروری ۲۰۱۴ء کو وہ دس بجے کے قریب غریب خانے پر تشریف لائے۔ چائے پی اور باتیں کرتے رہے۔ بولے میں اردو بازار جانا چاہتا ہوں۔ کھڑے ہوئے تو میں نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے، آپ تشریف لاتے ہیں تو بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ فرمایا: دعا ہے اللہ تعالیٰ زندگی کے آخری دم تک اسی طرح خوشی اور محبت کی نعمت عطا کیے رکھے۔

پھر اچانک ۶ مارچ کی صبح کو محبوب عالم صاحب کی طرف سے ٹیلی فون آیا کہ رات والد صاحب وفات پا گئے۔ یہ اچانک خبر تھی، سن کر نہایت افسوس ہوا اور بے ساختہ زبان سے انا اللہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ نکلے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی سعید احمد بھٹی کے ساتھ جنازے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ہر فقہی نقطہ نظر کے بے شمار لوگ جنازے میں شریک تھے۔

میں نے کہیں لکھا بھی ہے اور دوستوں سے کہا بھی کرتا ہوں کہ کوئی اہل حدیث عالم کی وفات کے ساٹھ ستر سال بعد اس کا کوئی پوتا یا نواسہ (اگر اپنے اس بزرگ سے تھوڑی بہت دلچسپی رکھتا ہو تو) ہم سے پوچھتا ہے کہ ہمارے یہ بزرگ کب فوت ہوئے تھے؟ ان کی علمی حیثیت کیا تھی اور اُنھوں نے کس استاذ سے علم حاصل کیا تھا؟ یعنی وہ عالم دادا یا نانا ان کا ہے اور حالات ہم سے پوچھے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس کوئی بریلوی عالم وفات پا جائے تو چالیسویں پر اس کے حالات میں کتاب چھپ کر آ جاتی ہے اور جو لوگ چالیسویں میں شریک ہوتے ہیں، کتاب خرید لیتے ہیں اور کتاب بالعموم اسی وقت ختم ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی معاملہ جناب محمد عالم مختار حق مرحوم کے سلسلے میں سامنے آیا۔ ان کے صاحب زادے جناب محبوب عالم تھابل نے ۹ مارچ ۲۰۱۴ء کو مجھے ٹیلی فون کیا کہ ۱۳/اپریل ۲۰۱۴ء کو والد صاحب کا

چالیسواں ہے، اس تاریخ تک ہم نے ان کے حالات میں کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس میں آپ کا مضمون شامل کرنا ضروری ہے، لہٰذا چار پانچ روز میں مضمون بھجوا دیں، چنانچہ مجھے جو کچھ میسر ہوا لکھ کر بھجوا دیا۔

۱۵/اپریل کو محبوب عالم تھابل تشریف لائے اور اپنی مرتب کردہ کتاب ''دلکشا تذکرہ میاں محمد عالم'' عنایت کی۔ ابتدائے کتاب میں مرتب نے اپنے والد گرامی کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا ہے اور ان کے خاندانی پس منظر کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد بائیس اہل قلم کے مضامین ہیں جن میں مرحوم کی علمی اور کتاب دوستی کے مختلف پہلوؤں کی خوب صورت انداز میں صراحت کی گئی ہے۔ مضمون نگاروں میں ڈاکٹر سفیر اختر، ڈاکٹر انور سدید، جناب محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر خالد ندیم، ڈاکٹر عارف نوشاہی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، پروفیسر حافظ محمد عطاء الرحمان قادری رضوی، سید معراج جامی، سید جمیل احمد رضوی، ڈاکٹر نذیر احمد شرق پوری اور دیگر متعدد حضرات شامل ہیں۔ چار تعزیتی خطوط بھی شامل ہیں، جن میں ایک خط جناب محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ) کا ہے اور چار حضرات کے منظوم تعزیت نامے ہیں۔

محبوب عالم تھابل صاحب کی ہمت قابل داد ہے کہ اُنھوں نے چند روز میں کتاب مکمل کر کے شائع کردی۔ بعض مضامین پر اُنھوں نے حواشی بھی لکھے ہیں۔ میرے مضمون کے آٹھ مقامات پر حواشی تحریر کیے گئے ہیں۔

چار پانچ سطروں میں میاں محمد عالم مختار حق مرحوم کے بارے میں مختلف حضرات کے تاثرات دیے گئے ہیں۔

محبوب عالم صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے بیس پچیس روز میں اپنے والدِ گرامی کے حالات میں کتاب شائع کردی جو متعدد اہل قلم کے مضامین کا معلومات افزا مجموعہ ہے۔ محمد عالم مختار حق ۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے اور ۶ مارچ ۲۰۱۴ کو فوت ہوئے۔ ٹھیک ۸۳ سال عمر پائی۔

میں نے کتاب پر تبصرہ شروع کیا تھا لیکن قلم ایسی راہ پر چل پڑا کہ تبصرے نے مضمون کی شکل اختیار کر لی۔



رمضان المبارک کے فضائل واحکام

تالیف: مولانا عبیداللہ مبارک پوری رحمہ اللہ

تحقیق وتعلیق: حافظ ندیم ظہیر

ناشر: مکتبہ اسلامیہ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

فون: 37244973

ضخامت: ۷۰ صفحات، عمدہ سفید کاغذ، کارڈ کور

تبصرہ نگار: محمد سلیم چنیوٹی

اللہ کریم کا بڑا فضل وکرم اور اس کا احسان ہے اپنے نیکوکار بندوں پر، مغفرت وبخشش کے طلب کاروں پر کہ اس نے سال بھر کی کمی وکوتاہی اور نیکیوں میں اضافے کے لیے ایک پر بہار اور بابرکت مہینا رمضان المبارک مقرر فرمایا۔ خوش بخت ہیں اللہ کے وہ بندے جو اس ماہِ مبارک کی نیک ساعتوں اور بخشش کے لمحات میں اپنے ربّ کی عبادتوں اور ریاضتوں میں مصروف رہتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتابچہ ماہ رمضان المبارک کے فضائل واحکام کے سلسلے میں بڑا پر مغز مقالہ ہے۔ اس میں رویتِ ہلال کے مسئلے سے لے کر روزے کے بارے مسائل، سحری، نیت روزہ، افطار کا وقت، فضائل صدقات وخیرات، مسافر و بیمار کے بارے احکام، تراویح اور اس کے بارے معلومات، تلاوت قرآن کریم، لیلۃ القدر، عیدالفطر، صدقۂ فطر اور اس کی مقدار کے بارے میں بیش تر مفید معلومات دی گئی ہیں۔

محترم محمد سرور عاصم صاحب نے اپنے مکتبے سے اس پمفلٹ کی اشاعت فرمائی اور حافظ ندیم ظہیر صاحب تعلیقات کے سلسلے میں تخریج وتحقیق اور حوالے لگا کر رمضان المبارک کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کو واضح و مدلل بنانے میں مدد کی ہے۔ اللہ کریم سب کی محنت قبول فرمائے۔ یہ رسالہ اپنے موضوع پر مفید مواد لیے ہوئے ہے۔

دینی مدارس کے طلبا کے لئے عظیم خوشخبری

ملک کی عظیم درس گاہ جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (فیصل آباد) میں ایک سالہ تخصص فی العقیدہ والدعوۃ کا آغاز کیا جارہا ہے جو طلبا کے روشن مستقبل کا ضامن ہوگا ان شاء اللہ۔

خصوصیات

1۔ایک سال میں عقیدہ ودعوت کے موضوع پر قدیم وجدید کتب کا تعارف اور اہم مضامین کی تدریس شامل نصاب ہوگی۔

2:امام ابن تیمہ، امام ابن قیم، الشیخ محمد بن عبدالوہاب اور علامہ نواب صدیق الحسن رحمہم اللہ کی عقائد پر کتب خصوصاً شامل نصاب ہوں گی۔

3: تدریس کے فرائض عقائد کے ماہر اساتذہ کرام سرانجام دیں گے۔

4:سعودی عرب کے جید علماء کرام آن لائن لیکچر دیں گے۔

5:ہر طالب علم کو برائے تحقیق انٹرنیٹ کی سہولیات باہم میسر ہوں گی۔

6:جامعہ تعلیم الاسلام کی عظیم الشان لائبریری تخصص کے طلبا کے لئے ہمہ وقت گھنٹے کھلی رہے گی۔

7:ملک کے مشہورو معروف جید علماء کرام کا براہ راست اور آن لائن محاضرات (لیکچرز) کا انتظام ہوگا۔

8:تخصص کے طلبا کے لئے معیاری رہائش کا انتظام کیا جائے گا۔

9:بحوث لکھنے کے لئے سٹیشنری کا مکمل انتظام جامعہ کی طرف سے ہوگا۔

10: تدریس اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ہوگی۔

مقاصد

☆فارغ التحصیل طلبا میں علمی وتحقیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا۔

☆ کتاب وسنت کی روشنی اور فہم سلف کے مطابق عقائد کی تعلیم سے طلبا کو آراستہ کرنا۔

☆عربی اور اردو میں تقریر وتحریر پر عبور حاصل کرنا۔

☆طلبا میں دعوتی وتبلیغی صلاحیتوں کو نمایاں کرنا۔

☆نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا کو سعودی یونیورسٹیز میں داخلے کے مواقع مہیا کرنا۔

☆طلبا میں اسقدر علمی استعداد پیدا کرنا کہ وہ کسی بھی مقام پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوکر خدمت دین سرانجام دینے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔

شرائط

1: کسی جامعہ سے فارغ التحصیل یا وفاق المدارس السّلفیہ سے شہادۃ العالیہ کا حامل ہونا ضروری ہے۔

2: کسی معروف شخصیت کا تزکیہ۔

3: زبانی ٹیسٹ۔

نوٹ

20 شعبان تک درخواستیں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں وصول کی جائیں گی۔ آخری سند کی فوٹو کاپی ہمراہ ارسال کریں۔25 شعبان سے 30 شعبان تک جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں ٹیسٹ ہوگا۔ تخصص کی تعلیم 16 شوال سے 15 شعبان تک ہوگی۔

الداعی الی الخیر: حافظ مقصود احمد صدر وارا کین انجمن جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (فیصل آباد)

فون: 041.3434221
موبائل مدیر التعلیم: 0301.7062822
مدیر: 03334433203
0321.2103198

عوامی میلہ

معراجِ انقلاب کا محور دھمال ہے
ہر نوجواں کو نور جہاں کا خیال
اس پر کیا ہے غور عزیزانِ راس و چپ
حالاتِ حاضرہ کا نتیجہ؟ زوال ہے
لکھوں تو کیا؟ قلم کی زباں پر ہے اعتذار
دل ہے شکستہ حال طبیعت نڈھال ہے
ہر چند اس کا حسنِ خداداد زندہ باد
ازبس کہ شاعری کے اُفق پر ہلال ہے
یارو! خطا معاف کہاں آگیا ہوں میں؟
ہر لحظہ اس چمن کی فضا پائمال ہے
یا ربِ ذوالجلال! زبان و قلم کی خیر
اس ''نازنیں'' کے عہد میں جینا محال ہے
نادر نے دلی لوٹ لی ، ماضی کو چھوڑیے
اس عہد میں تو ساری ''خدائی'' وبال ہے
پیر مغاں ہے ''شیخِ طریقت'' کے روپ میں
لیکن فقیہِ شہر ابھی تک کلال ہے
شورشؔ نہیں ہے مصرعۂ اولیٰ کی احتیاج
تیری نوائے شعر اذانِ بلال رضی اللہ عنہ ہے

(شورشؔ کاشمیری)